ربیع الثانی۔جمادی الاخریٰ ۱۴۳۸ھ
جنوری۔مارچ ۲۰۱۷ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

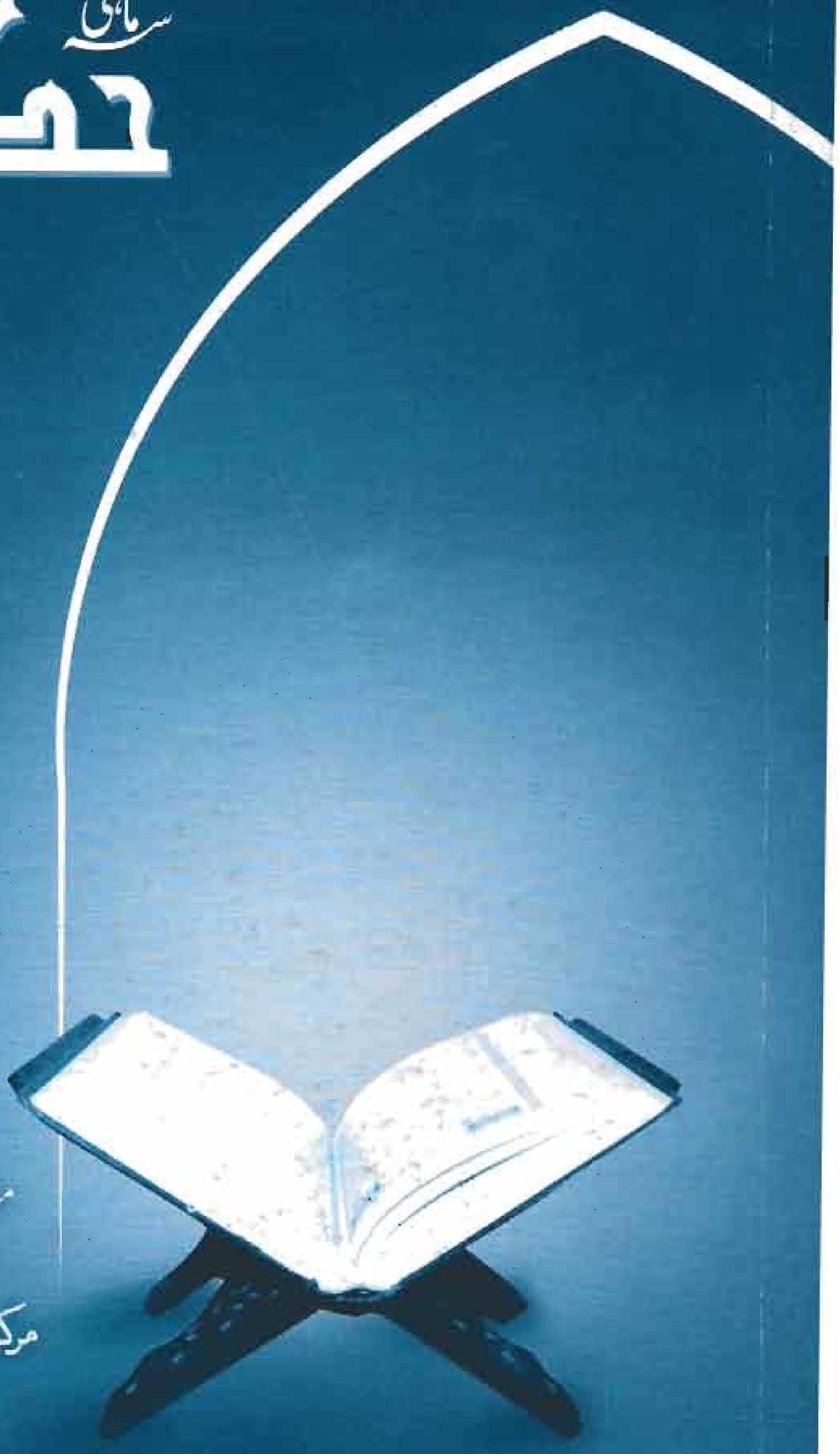

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

صفحات394، قیمت485روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ

صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات

صفحات484، قیمت590روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس

صفحات560، قیمت650روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر بختونخوا، پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

لبرل ازم، مذہب اور فکرِ اقبال	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل (۸)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	9

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	22

بحث و نظر

اسلامی ریاست کسے کہتے ہیں.....؟	ایک مکتوب اور اس کا جواب	40

تعلیم و تعلّم

کامیاب استاذ کی صفات	مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر	47

مُکالمہ

حُجیتِ حدیث اور انکارِ حدیث: ایک تجزیاتی مطالعہ (۲)	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر	59

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	79

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لبرل ازم‘ مذہب اور فکرِ اقبال

ہمارے ہاں کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ معاشرے اور سماج کی تشکیل میں فیصلہ کن رول نظریات کا نہیں بلکہ رویّوں کا ہوتا ہے‘ چنانچہ اس طرح وہ نظریہ‘ عقیدہ یا علمی نقطہ نظر (doctrinal belief) سے علیحدہ رویّے یا طرزِ عمل کی ثنویت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں لبرل ازم رویہ بھی ہے اور نظریہ بھی۔ اسی طرح مذہب بھی دونوں کا مجموعہ ہے۔ ایک ذہین اور طبّاع کالم نویس خورشید ندیم انہی مقدمات کو آگے بڑھاتے ہوئے خیال آرائی فرماتے ہیں کہ رویے کے باب میں کم از کم سماجی سطح پر مذہب اور لبرل ازم میں اتفاق زیادہ اور اختلاف کم ہے۔ اسی طرح ان کے لیے سوشل میڈیا کے بلاگرز کی حالیہ گمشدگی کے پس منظر میں دینی اور لبرل طبقات کی آویزش ناقابلِ فہم ہے اور وہ اسے صرف جہالت اور جذباتیت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ (۱)

نظریہ کے طور پر لبرل ازم اور مذہب کا بیانیہ جناب خورشید ندیم نے جس طرح دیا ہے‘ اسے میں اپنے نقد و تبصرہ سے پہلے یہاں ترتیب وار من وعن نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین کے سامنے ان کی پوزیشن پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے:

(ا) ’’بحیثیت نظریہ‘ لبرل ازم کا کہنا ہے کہ انسان ایک آزاد وجود کا نام ہے۔ وہ اپنے معاملات‘ اپنی عقل اور بصیرت سے طے کرے گا۔ یہ حق کسی مذہب‘ دوسرے لفظوں میں کسی خالق کو نہیں دیا جاسکتا کہ وہ انسان کے لیے کسی لائحہ عمل کا تعین کرے۔ ’خالق‘ ان کے خیال میں محض ایک واہمہ اور گمان ہے۔ زندگی واہموں کی بنیاد پر بسر نہیں کی جاسکتی۔ انسانی عقل‘ تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں زندگی کے معاملات کو طے کرے گی۔ انفرادی عقل پر اجتماعی عقل کو غلبہ ہوگا اور یہ فیصلہ کن ہوگا۔ اجتماعی عقل چاہے تو کسی مذہبی تعلیم کو قبول کرلے‘ چاہے تو رد کردے۔ کائنات میں ارتقاء کا ایک عمل لاکھوں سالوں سے جاری ہے جس نے زندگی کو مختلف مراحل سے گزارا۔ انسان بھی اسی ارتقا کا ایک مرحلہ ہے۔ یہی ارتقا اصل خالق ہے۔ ڈارون سے پہلے بھی لبرل ازم یہی تھا اور اب بھی یہی ہے۔ الحاد بطور نظریہ لبرل ازم کی اساس ہے۔

(ب) بحیثیتِ نظریہ‘ مذہب کا کہنا ہے کہ انسان آزاد نہیں‘ خدا کا بندہ ہے۔ بندے کا ایک ترجمہ ’غلام‘ بھی ہے۔ غلام کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کے احکام بجالائے۔ اسی سے اس کی جزا اور سزا وابستہ ہے۔ اللہ اس کائنات کا خالق ہے۔ اسی نے انسان کو تخلیق کیا۔ زندگی اگر کسی ارتقا کا نتیجہ ہے تو بھی‘ یہ ایک بے مہار عمل نہیں ہے جو کسی نظم اور ترتیب کے بغیر جاری و ساری ہے۔ یہ کائنات حفظِ ترتیب کا شاہکار اور ایک کارساز و حکیم کا تخیل ہے‘ جس نے اسے کسی مقصد کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ انسان کی تخلیق زندگی کے ارتقا کا

(۱) خورشید ندیم‘ کالم ’’لبرل ازم‘ مذہب اور معاشرہ‘‘ روزنامہ دنیا‘ ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء

ایک مرحلہ نہیں' الٰہی سکیم کا ایک باب ہے۔ وہ کہیں سے آیا اور اس نے کہیں جانا ہے۔ موت زندگی کا اختتام نہیں' ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہونا ہے۔ دوسرے عہد میں' اس زندگی کے بارے میں سوال ہونا ہے کہ وہ خدا کا بندہ بن کر زندہ رہا یا اس سے بے نیاز رہا۔ اسی کے جواب پر اس کے لیے سزا اور جزا کا فیصلہ ہوگا۔ خدا کی بندگی کا مفہوم اس کی فطرت میں ودیعت ہے اور اسے یاد دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر مبعوث کرتا ہے جو انسانوں میں سے ہوتے ہیں۔ سیدنا محمد ﷺ پر یہ سلسلہ تمام ہوا۔ تاہم آپ کی لائی ہوئی ہدایت اور فطرت کی شہادت تادمِ آخر انسان کو بتاتی رہے گی کہ خدا کی بندگی سے کیا مراد ہے۔

(ج) بطور رویہ' لبرل ازم یہ ہے کہ زندگی کے باب میں کسی نقطہ نظر یا نظریے کو اختیار کرنا ایک انفرادی معاملہ ہے۔ کوئی خدا کو مانتا ہے تو بالجبر اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو اس سے بالجبر منوایا نہیں جا سکتا۔ لوگ اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ وہ جو سیاسی نظام چاہیں' اختیار کر سکتے ہیں۔ معیشت کے باب میں بھی ان کا ہاتھ نہیں پکڑا جا سکتا۔ لباس' رہن سہن' یہ سب انفرادی معاملات ہیں۔ ریاست اگر اجتماعی مفاد میں کوئی قانون بنانا چاہے تو وہ اس کا حق رکھتی ہے' بشرطیکہ یہ قانون لوگوں کی رائے سے بنے۔ قانون سازی کا مطلب اجتماعی مفاد میں فرد کی آزادی پر قدغن لگانا ہے۔ لبرلز میں ایک طبقہ 'انارکسٹ' ہے جو ریاست کے وجود اور نتیجتاً کسی قانون کو نہیں مانتا۔ تاہم یہ محض ایک خیال ہے جو نا قابل عمل ہے۔

(د) بطور رویہ مذہب یہ ہے کہ زندگی کے باب میں کسی نقطہ نظر یا نظریے کو اختیار کرنا ایک انفرادی معاملہ ہے۔ کوئی خدا کو مانتا ہے تو بالجبر اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو اس سے بالجبر منوایا نہیں جا سکتا۔ لوگ اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ وہ جو سیاسی نظام چاہیں' اختیار کر سکتے ہیں۔ معیشت کے باب میں بھی ان کا ہاتھ نہیں پکڑا جا سکتا۔ لباس' رہن سہن' یہ سب انفرادی معاملات ہیں۔ ریاست اگر اجتماعی مفاد میں کوئی قانون بنانا چاہے تو وہ اس کا حق رکھتی ہے' بشرطیکہ یہ قانون لوگوں کی رائے سے بنے۔ تاہم قانون بنانے والے یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا زیر نظر مسئلے میں خدا یا اس کے رسول کی کوئی ہدایت موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کو نافذ کیا جائے گا۔ اگر اس کی تعبیر میں اختلاف ہو جائے تو پھر اکثریت کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کا موقف قانون کی بنیاد بنے۔ انسان اگر انفرادی زندگی میں بندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تو یہ اس کا اور اُس کے ربّ کا معاملہ ہے' جس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے۔''

راقم بطیبِ خاطر اعتراف کرتا ہے کہ خورشید ندیم صاحب نے چار پیرا گرافس (ا' ب' ج' د) میں بہت عام فہم انداز میں مذہب اور لبرل ازم کے بنیادی نکات بیان کیے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وہ اگر تھوڑی سی احتیاط اور تفحص سے کام لیتے تو آزادی اور اختیار کا عنصر بطور رویہ مذہب کے کھاتے میں نہ ڈالتے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے بطور رویہ لبرل ازم اور مذہب کے بیان میں پانچ چھ جملے بالکل یکساں لکھ دیے ہیں۔ پیرا (د) میں وہ پہلے یہ فرماتے ہیں کہ ''لوگ اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ وہ جو سیاسی نظام چاہیں' اختیار کر سکتے ہیں۔ معیشت کے باب میں بھی ان کا ہاتھ نہیں پکڑا جا سکتا۔ لباس' رہن سہن یہ سب انفرادی معاملات ہیں.....'' لیکن پھر انہیں ایک ضروری تصریح کا اضافہ کرنا پڑتا ہے ــــ ''تاہم قانون بنانے والے یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا

زیرِنظر مسئلے میں خدا یا اس کے رسول کی کوئی ہدایت موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کو نافذ کیا جائے گا.....''

کالم کے آخر میں بطور رویّے مذہب اور لبرل ازم کے درمیان مشترکات بیان کرتے ہوئے چھٹے اور آخری نکتے (۲) میں آزادیٔ رائے کو ایک ایسی بنیادی قدر قرار دیا گیا ہے جس پر کوئی فرد' گروہ یا ریاست پابندی نہیں لگا سکتی۔ یہ ریاست کا فرض ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ اپنی حد سے تجاوز کرے تو اس کے خلاف اقدام کرے۔ حد سے تجاوز کا تعیّن فطری' قانونی اور سماجی مسلّمات کی بنیاد پر ہوگا۔ یہاں مذہب اور لبرل ازم کے رویوں کی مزعومہ یکسانیت کی وضاحت میں خدا اور اس کے رسول کی ہدایت کا حوالہ وہ بالکل گول کر گئے ہیں یا کم از کم اس کا صراحتاً ذکر نہیں کیا۔ اور وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہر دو کے درمیان فرق و تفاوت کا اصل سبب ہی مذہبی معاشرے کا علمیات میں وحی کی ہدایت اور روشنی کو تسلیم کرنا ہے جبکہ لبرل طبقہ اس کا سرے سے انکار کرتا ہے۔ اور ہر اعتبار سے اپنے آپ کو خود مکتفی اور خود مختار سمجھتا ہے۔

راقم پوری سنجیدگی اور دیانت داری سے عرض کرتا ہے کہ رویّے اور نظریے کی دوئی یا امتیاز اس کے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شعوری اور منضبط انداز میں زندگی بسر کرنے والے فرد کا رویّہ اور علمی روش اس کے نظریات کے تحت اور زیر اثر ترتیب و تشکیل پاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عقیدہ یا نظریہ ہی رویّوں کا خالق ہوتا ہے۔ چونکہ مذہب اور لبرل ازم کے بنیادی نظریات میں بُعد المشرقین ہے اس لیے ان کے تحت تشکیل پانے والے رویوں کو یکساں اور ہم آہنگ کہنا اپنے اندر شدید تناقض رکھتا ہے۔ اور ان دو کے درمیان تلفیق و تطبیق سعیٔ نامسعود ہے۔ نظریے اور عملی رویے کا گہرا تعلق کسی بھی سنجیدہ اور بااصول شخص کی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گزشتہ صدی کے یورپی وجودی فکریات میں ایسے شخص کو ہی فرد مصدّقہ (authentic individual) کہا گیا۔ اس سلسلے میں وجودی مفکّرین کے علاوہ ماہرین نفسیات نے بھی گہرائی سے ان فنامنا (phenomena) کا مطالعہ کیا ہے۔ اور رویے اور نظریے کے ارتباط کو اہمیت دیتے ہوئے ایک صحت مند اور تعمیری کردار کے خدوخال واضح کیے ہیں۔ متعدد سائیکاٹرٹس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نظریے اور عملی رویے میں عدم مطابقت غیر انضمامی شخصیت (disintegrated personality) کی شکل میں سامنے آتی ہے' اور سماج میں غیر پسندیدہ رجحانات اور افعال کا مظاہرہ کرتی ہے۔

دِقتِ نظر سے دیکھا جائے تو لبرل ازم اور مذہب کے درمیان اصل نزاع نظریۂ علم یعنی علمیات (epistemology) کے حوالے سے ہے۔ لبرل ازم میں یقین رکھنے والا شخص اپنے تمام علمی مسائل اپنی عقل اور بصیرت سے طے کرنا چاہتا ہے' یعنی وہ اپنی عقل و دانش کو رسا سمجھتا ہے۔ جبکہ وہ اس طرح گزشتہ ایک صدی کے دوران مغرب اور مشرق دونوں میں چوٹی کے جو متعدد فلاسفہ انسانی عقل و فکر کی واماندگی آشکارا کرتے ہیں' کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یورپ کی تحریکِ تنویر کے آغاز ہی میں جرمن فلسفی عمانویل کانٹ نے تنقید عقل محض میں عقل انسانی کی حدود متعین کر کے اس کا بڑھا ہوا زعم اور زور توڑنے کی سعی بلیغ کی تھی اور مذہب کو عقل

(۲) صاحبِ مضمون کے ان نکات پر اگلے صفحات پر میں اپنے ملاحظات پیش کروں گا۔

محض کی گرفت سے آزاد کیا تھا۔ ایسی عقل جو جزئی سطح پر اشیاء کا اثبات تو کرتی ہے مگر حقیقت کو اس کے کل میں دیکھنے سے قاصر ہے‘ یعنی مذہب کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا اثبات عقل انسانی کے محدود پیمانوں سے بالاتر ہے۔ علامہ اقبالؒ کانٹ کے تشکک کا غزالیؒ کے تشکک سے موازنہ کرتے ہیں اور عقل اور مذہب کے جدل میں ان سے سند لاتے ہیں‘ اور عقل و منطق کی تحدیدات کو قبول کرتے ہوئے اپنا تعلق اس علمیات سے رکھتے ہیں جو قرآن اور اسلام انسان کو دیتے ہیں۔

مشاہدے‘ تجربے‘ تعمیر ارض اور غور و فکر کی قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ نے ایمان کے مسلمات‘ خداشناسی‘ اتباع رسول ﷺ اور اُخروی فوز و فلاح کو بنیادی اہمیت دی ہے اور مغربی فکر اور تہذیب و تمدن کا سیکولر اور ایمان سے تہی دست ہو جانا انہیں بہت کھلتا تھا۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ سائنس کے سائنٹزم (scientism) بن جانے کے سخت ناقد تھے۔ اپنی متعدد نگارشات اور شاعری میں انہوں نے جدید دور کے مغربی انسان کا سائنس اور ٹیکنالوجی کو انسان کے جملہ وجودی‘ اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کی نسبت ترجیح دینے پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کے یہ اشعار فلسفہ و حکمت اور سوشل سائنسز میں طبیعیاتی علوم کے مماثل ترقی اور ارتقا نہ ہونے کا نوحہ ہیں: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

راقم الحروف نے یونیورسٹیوں میں ’سماجی علوم کا فلسفہ‘ مضمون ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر پڑھایا ہے۔ اس کا احساس ہے کہ تنزیلِ ربانی اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی سے مغربی سکالرز منہ موڑ کر بہت سے تضادات اور لاینحل مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ خورشید ندیم صاحب کے نزدیک آزادیٔ رائے ایک بنیادی قدر ہے جس سے بقول ان کے کوئی مذہبی اور لبرل آدمی اختلاف نہیں کرے گا۔ میرے خیال میں وہ یہاں بھی شاعر مشرق کے انتہائی گہرے تفکّر و تدبّر کے حاصلات کو یکسر نظر انداز کر رہے ہیں۔ مدیر ماہنامہ حکمت بالغہ جناب انجینئر مختار حسین فاروقی نے بالکل صحیح خیال کا اظہار کیا ہے کہ نوجوانوں کو لیپ ٹاپ دے کر اور انٹرنیٹ پیکیجز سستے اور عام کر کے ’علم کی مغربی دنیا‘ اور الحاد کا راستہ دکھایا جا رہا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

یعنی اس عمر میں بغیر کسی محکم نظریاتی تعلیم کی حد بندی کے نوجوان تو اغلباً اپنی اس عمر کے تقاضوں اور ’زمانے کی چال‘ کے مطابق چلے گا۔ بے مہار آزادی سوچ میں تلون اور سماج کے مخالف مزاج اور رویہ کو پروان چڑھاتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ لبرل ازم اور جدیدیت گزیدہ کچھ دانشوروں کے نزدیک اسلام بنیادی طور پر syncretic یعنی وحدت ادیان کا عنصر لیے ہوئے ہے‘ جو کہ بالبداہت ایک لغو اور بے بنیاد مفروضہ ہے۔ قرآن و سنت اور دینِ اسلام کی اساسات سے ناواقف حضرات ہی ایسا موقف اختیار کر سکتے ہیں۔

سطور بالا میں ذکر کیا گیا تھا کہ کالم کے آخر میں مذہب اور لبرل ازم کے رویوں میں ہم آہنگی اور یکسانیت

ثابت کرنے کے لیے جناب خورشید چھ نکات کی نشاندہی کرتے ہیں جو ہمارے تبصرے کے ساتھ درج ذیل ہیں:

(۱) عقیدہ یا نقطہ نظر (Worldview) ایک فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ فرد کے اس حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ کسی کو قبول مذہب کے معاملے میں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ قبولِ مذہب کے بعد آزادی نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ لبرل اور ملحد حضرات / خواتین کو اپنے افکار کے پرچار کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ مذہب اپنے نہ ماننے والے کے لیے بھی اپنے بنائے ہوئے نظام میں binding ہوتا ہے۔ آزادی اور آزادیٔ رائے کا نظام مذہب کنٹرول کرتا ہے۔ جبر کا نہ ہونا محدود معنی میں ہے' کیونکہ فرد معاشرے میں کوئی الگ تھلگ جزیرہ نہیں ہوتا بلکہ ایک interactive entity ہوتا ہے' لہٰذا مذہب غیر مسلم کو بھی ان حدود و معاشرت و اخلاق کا پابند بنا کر رکھے گا جو اس کے ورلڈ ویو کی بنیاد ہیں۔

(۲) طرزِ عمل بھی ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ اسے کسی خاص لباس' رہن سہن یا اسلوبِ حیات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔

اگر یہ کوئی فقہی جملہ ہو کہ مذہب کسی خاص رہن سہن یا لباس کا پابند نہیں بناتا تو شاید اس کو قبول کیا جاسکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مذہب نے کوئی خاص لباس متعین نہیں کیا' لیکن یہ کہنا کہ مذہب ہر طرح کے لباس اور رہن سہن کی اجازت دے گا بالکل لغو ہے۔ کیا اسلامی معاشرت میں خواتین کو بکنی پہن کر گھومنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

(۳) سماج کو فساد اور جرم سے بچانے کے لیے ریاست قانون سازی کرے گی۔ گویا ریاست یہ حق رکھتی ہے کہ اجتماعی مفاد میں فرد کی آزادی پر کوئی قید لگائے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی اور یہ بالکل درست ہے۔ البتہ مذہب قانون سازی کی حدود و قیود اور اس کے مآخذ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

(۴) یہ قانون سازی لوگوں کے مشورے سے ہوگی اور اختلاف کی صورت میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوگی۔

اگر قرآن وسنت کو قانون سازی کا مبدأ و مرجع بنا کر اور ان کی ریاستی اور معاشرتی حاکمیت کو عمل میں لانے کا قصد کر کے قانون سازی کی جائے گی تو اس عمل میں ہم مقصد اور ہم عقیدہ لوگوں کی اکثریتی رائے کو فوقیت حاصل ہوگی۔ اکثریت اگر بے دین لوگوں کی ہو تو ان کی رائے فیصلہ کن کیسے ہوسکتی ہے۔ اصولی بات یہ ہے' جس کے ہم مکلّف ہیں کہ ہماری قانون سازی کے سارے عمل کی اساس قرآن وسنت پر ہو اور قرآن وسنت کے تفقّہ رکھنے والے لوگوں کی مشاورت اور ہمکاری سے یہ عمل تکمیل پائے۔ مباحات کے دائرے میں اور اجتہادی آراء کے اختلاف کی صورت میں اصحابِ رائے میں اکثریتی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔

(۵) ہم کسی قانون سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں' لیکن کثرتِ رائے کی بنیاد پر بننے والا قانون اس وقت تک نافذ العمل ہوگا جب تک کہ اجتماعی بصیرت اس میں ترمیم کا فیصلہ نہ کرلے۔

انتظامی اور مفادِ عامہ کی حد تک یہ بات ٹھیک ہے جنہیں ہم natural قوانین کہہ سکتے ہیں' لیکن اگر یہ قوانین قرآن وسنت سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان کی حاکمیت کے لیے بنائے گئے ہیں تو اس کے لیے وہی ہیئت مشاورت

اختیار کی جائے گی جس کے اراکین کی اکثریت رسوخ فی العلم رکھتی ہو۔ ویسے بھی اسلامی قانون سازی کے عمل میں اجتماعی بصیرت کا تصور اضافتی (relative) ہے‘ البتہ مفادِ عامہ کے معاملات میں اجتماعی بصیرت فیصلہ کن ہے۔

(۶) آزادیٔ رائے ایک ایسی بنیادی قدر ہے جس پر کوئی فرد‘ گروہ یا ریاست پابندی نہیں لگا سکتی۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ اپنی ’’حد‘‘ سے تجاوز کرتے ہوئے‘ کسی کے اس حق کو دبانے کی کوشش کرے تو وہ اس کے خلاف اقدام کرے۔ ’’حد سے تجاوز‘‘ کا تعین فطری‘ قانونی اور سماجی مسلمات کی بنیاد پر ہوگا۔

’’حد‘‘ کا قیام کہاں سے عمل میں آئے گا؟ اس میں قرآن وسنت حتمی ہے۔ قرآن وسنت کے متعیّن کردہ حدودِ آزادی کی مکمل نگہداری کی جائے گی اور ان لوگوں سے بھی ان کی پابندی کروائی جائے گی جو فی الحال قرآن وسنت کو نہ مانتے ہوں۔ ہاں زندگی کے عمومی معاملات میں آزادیٔ رائے کا ہر فردِ ریاست کو پورا موقع دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ مسلمات کا دائرہ اگر دینی ہے تو ان کی ہر دائرے میں حفاظت کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر ان مسلمات کی بنیاد مذہب کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر ہے تو انتظامی مصلحت سے ان کی حفاظت کی جائے گی لیکن ان سے اختلاف کے حق کو سلب نہیں کیا جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے اپریل ۱۹۳۸ء سے صرف چار پانچ ماہ قبل ایک خاص ذہنی وروحانی کیفیت میں جو قطعہ کہا تھا اور اسے سید نذیر نیازی مرحوم کے مطابق اپنی حیاتِ دنیوی کے اختتام کے آخری ساعتوں میں بھی دہرایا‘ اس کا ایک مصرعہ ع ’’دگر دانائے راز آید کہ نہ آید!‘‘ بہت اہم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عمل میں مرکزی کردار کا حامل ہے۔ علامہ سمجھتے تھے کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے عالمی احیاء کے لیے علمی انداز میں اسلام کی حقانیت اور مغربی فکر وتہذیب کے رد کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ایک ایسے ہی ’’دانائے راز‘‘ —— پروفیسر ڈاکٹر شبیر اختر (پ: ۱۹۶۰ء) —— جو انگلستان میں پلے بڑھے اور اعلیٰ ترین عصری تعلیم کے ساتھ السنہ شرقیہ بشمول عبرانی اور علوم القرآن وحدیث اور ادیان کے کلاسیکل اور جدید لٹریچر میں گہری ممارست حاصل کی‘ ان کی لبرل ازم کے بارے میں سوچ درج ذیل ہے جو ہمارے سیکولر دانشوروں کو دعوتِ فکر دیتی ہے:

Liberalism as a political philosophy and ideology is often a defence of the personal biases of a privileged western academic class whose professed self-identity is liberal. Muslims see nothing 'liberal' in a creed whose hallmarks, at its extreme, are an idolatry of art allied to an obsession with extending the arena of obsecenity. The grand issues- tackling racism, maintaining single standards of justice, secuing freedom and liberty for all humanity as opposed to western humanity- are hardly addressed. Establishment liberals mistake their own affluence for a universal condition. [3]

(باقی صفحہ 79 پر)

(3) Dr. Shabbir Akhtar, "The Quran and the Secular Mind", Routledge (London & New York) 2008 pp.347-8

مِلاكُ التأوِيل(۸)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورۃ آل عمران

(۴۸) آیت ۴۰:

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ﴾

''(زکریاؑ نے) کہا: پروردگار! میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا' حالانکہ میں بڑی عمر کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔''

اور سورۃ مریم میں ارشاد فرمایا:

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸﴾

''میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا' جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔''

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ جب بات دونوں جگہ ایک ہی ہے تو الفاظ مختلف کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو دونوں سورتوں میں ایک ہی قصہ بیان ہوا ہے لیکن الفاظ میں تقدیم وتاخیر سورۂ مریم کے فواصل (آیات کے آخری الفاظ کہ جن سے ایک آیت اور دوسری آیت میں امتیاز پیدا ہوتا ہے) کے اعتبار سے ہے۔ شروع سورت سے ملاحظہ کیجیے:

﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝۲ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝۳﴾ (آخری لفظ ''یاء'' ہے)

اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول تک یہ فواصل اسی طرح چلے آتے ہیں:

﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝۳۳﴾

اس سورت کی پہلی ۳۲ آیات میں انہی فواصل کا التزام رکھا گیا ہے اور پھر سات آیات کے بعد دوبارہ یہی فواصل نمودار ہوتے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱﴾

اور پھر آیت ۴۷ تک ''یاء'' کے ساتھ اور آخری آیت تک ''الف'' کے ساتھ چلے آتے ہیں' اس لیے سورۂ مریم میں آیات کا اس طرح آنا ہی مناسب تھا۔ اس کے مقابلے میں سورۂ آل عمران میں ایسے کسی خاص فاصلے کا

التزام نہیں رکھا گیا' اس لیے وہاں اندازِ بیان سورۂ مریم سے مختلف ہے۔

(۴۹) آیت ۴۱:

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ﴾

''(زکریاؑ نے) کہا: اے رب میرے لیے کوئی نشانی دکھا دے۔''

یعنی میری بیوی کے حاملہ ہونے پر جو بشارت دی گئی ہے وہ جلد از جلد ظاہر ہو جائے۔ جواباً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ﴾

''تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن تک بات نہیں کرو گے مگر اشارے سے۔''

سورۂ مریم میں اسی بات کو یوں بیان کیا گیا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰﴾

''تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ تم باوجود ٹھیک ٹھاک ہونے کے تین راتوں تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیات میں عبارات کا اختلاف کیوں ہے' جب کہ مضمون ایک ہے؟

اس کا جواب یہ ہے — واللہ اعلم — کہ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اُن کا بات کرنے سے معذور ہونا صرف دن یا صرف رات تک کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مسلسل تین دن اور رات یعنی ۷۲ گھنٹوں تک جاری رہے گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے قومِ عاد کے عذاب کے بارے میں کہا گیا:

﴿سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۝۷﴾ (الحاقة)

''اس (تیز و تند ہوا) کو ان پر لگاتار سات رات اور آٹھ دن تک اللہ تعالیٰ نے مسلّط کیے رکھا۔''

اور اس طرح یہ واضح کر دیا کہ یہ عذاب کسی خاص عرصے کے لیے نہیں ہے بلکہ دن رات مسلسل جاری رہے گا۔

اب یہاں ایک بات کی اور مزید وضاحت ہو جائے کہ سورۃ آل عمران میں دن کا ذکر ہے اور سوائے اشاروں کے زبان سے بات نہ کرنے کا ذکر ہے۔ اشارہ آنکھ اور ہاتھ سے ہو سکتا ہے' اور بقول مجاہد لبوں سے بھی ہو سکتا ہے' لیکن یہ اشارہ کیسے بھی ہو صرف آنکھ سے ہی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے' اس لیے دن کے ذکر کے ساتھ ''رَمْزًا'' کہا گیا۔ اور اسی لیے جہاں سورۂ مریم میں رات کا ذکر ہے تو وہاں ''رَمْزًا'' نہیں لایا گیا لیکن دونوں اوقات کا احاطہ ہو گیا۔

سورۂ مریم کی آیت میں رات کے ساتھ ''سَوِیًّا'' کا لفظ لایا گیا' اسے اگر رات کی صفت قرار دیا جائے تو مطلب ہوگا: تین راتیں جو برابر سرابر ہوں گی اور اگر اسے زکریاؑ کی طرف لوٹایا جائے تو مطلب ہوگا کہ وہ بول نہ پائیں گے' لیکن یہ کسی گونگے پن اور بیماری کی بنا پر نہ ہوگا۔

یہاں بھی سورۂ مریم کے فواصل کے اعتبار سے ''سَوِیًّا'' لایا گیا جبکہ سورۃ آل عمران میں ان فواصل کے لانے کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور یوں دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم!

(۵۰) آیت ۴۸۔۴۹:

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ﴾

''اور وہ انہیں کتاب وحکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا' کہ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں' میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل پیدا کرتا ہوں' پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے پرندہ بن جاتا ہے' اور میں اللہ کے اذن سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو بھلا چنگا کر دیتا ہوں' اور مُردوں کو میں زندگی ڈال دیتا ہوں' اور تمہیں وہ کچھ بتا دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔''

اور سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ ۚ﴾ (آیت ۱۱۰)

''اور جب تم مٹی سے پرندے کی شکل بناتے تھے میرے اذن سے' اور پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ پرندہ بن جاتا میرے اذن سے' اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو بھلا چنگا کر دیتے تھے میرے اذن سے' اور جو تم مُردوں کو کھڑا کر دیتے تھے میرے اذن سے۔''

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ آل عمران میں ضمیر مذکر ہے (فَاَنْفُخُ فِيْهِ)

اور سورۃ المائدۃ میں مضمون وہی ہے اور ضمیر مؤنث ہے (فَتَنْفُخُ فِيْهَا)

(۲) سورۂ آل عمران میں معجزات کا ذکر کیا اور دو دفعہ ''بِاِذْنِ اللّٰهِ'' کہا گیا' اور اللہ کا نام لیا گیا۔ برخلاف سورۃ المائدۃ کے' کہ اس میں چار دفعہ اذنِ ربّ کا ذکر کیا لیکن اس کی نسبت ضمیر رب کی طرف کی گئی (بِاِذْنِىْ)۔

پہلے سوال کے جواب میں زمخشری نے وضاحت کی ہے کہ ضمیر مذکر ہے اور اس کا اشارہ ہے اس ''شَیْء'' کی طرف جو پرندے کی شکل جیسی تھی' (''شَیْء'' مذکر ہے اس لیے ضمیر مذکر لائی گئی) اور سورۃ المائدۃ میں اشارہ ہے اس صفت کی طرف جو پرندے کی شکل کے مشابہ تھی' (یعنی صفت پرندے کی ہیئت کی' جو مؤنث ہے' اس لیے ضمیر بھی مؤنث لائی گئی) اور اسی اعتبار سے پہلی آیت میں ''يَكُوْن'' ہے (جو کہ مذکر کا صیغہ ہے) اور دوسری آیت میں ''تَكُوْنُ'' ہے جو مؤنث کا صیغہ ہے۔

لیکن یہاں ابھی ایک اشکال باقی ہے کہ سورۃ آل عمران میں ضمیر کا مذکر لانا اور سورۃ المائدۃ میں مؤنث لانا' خاص طور پر کیوں ہے؟ اس کے جواب میں ایک اصولی بات تو یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیات کی ترتیب میں بھی کچھ راز پنہاں ہیں' اور یہ کہ ضمیر کا لفظ کی طرف عود کرنا' اولیٰ ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے معنی کی

طرف پھیرا جائے۔ اور پھر ترتیب کے لحاظ سے پہلے ضمیر مذکر لائی گئی کہ سورۃ آل عمران میں ''کافِ تمثیل'' (کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ) ''مثل'' کی جگہ لایا گیا یعنی ''کاف'' اور ''مثل'' ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہے ہیں' تو یہاں صریح لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے اور سورۃ المائدۃ میں کافِ تمثیل کو صفت کے معنی میں لیا گیا ہے جو کہ مؤنث ہے اور ترتیب اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ پہلے صریح لفظ کا اعتبار کیا جائے اور اس کے بعد معنی کا اعتبار کیا جائے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سورۃ الاحزاب میں ازواجِ رسول ﷺ کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا﴾ (آیت ۳۱)

''اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور نیک عمل کرے.....''

یہاں پر ''مَنْ'' کے اعتبار سے ''یَقْنُتْ'' میں مذکر کا صیغہ لایا گیا اور پھر معنی کے اعتبار سے ''تَعْمَلْ'' میں مؤنث کا صیغہ لایا گیا۔ اور اسی طرح کی کئی اور مثالیں بھی ہیں' یعنی لفظ کا اعتبار پہلے اور معنی کا اعتبار بعد میں' بالکل ایسا ہی سورۃ آل عمران اور سورۃ المائدۃ کی متذکرہ بالا آیات میں کیا گیا۔ جو سورت ترتیب میں پہلے ہے اس میں لفظ کا اعتبار ہے اور جو سورت ترتیب میں بعد میں ہے اس میں معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔

اس اشکال کا ایک جواب اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۃ آل عمران کی آیت ۴۴ ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ سے لے کر آیت ۴۹ ''فَاَنْفُخُ فِيْهِ'' تک تقریباً بیس کے قریب ضمائر آئی ہیں جو سب کی سب مذکر ہیں تو مناسب تھا کہ ان ضمائر کی اکثریت کا اعتبار کر کے ''فَاَنْفُخُ فِيْهِ'' میں ضمیر مذکر لائی جاتی' اور اس کے مقابلے میں سورۃ العُقود (المائدۃ) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ فرمایا گیا: ﴿اُذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ﴾ (یاد کرو وہ نعمت جو میں نے تم پر کی) اور پھر کئی نعمتیں گنوائیں' جن میں مٹی سے پرندہ بنانے اور اس میں پھونک مارنے کا بھی ذکر آتا ہے' اور اس لحاظ سے ''نعمت'' کا اعتبار کر کے ضمیر مؤنث کا لایا جانا مناسب تھا' اور یہ بھی خیال رہے کہ یہاں اس کثرت سے ضمائر نہیں لائی گئیں جیسے سورۃ آل عمران میں تھیں۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ سورۃ المائدۃ میں الفاظ کے اختصار کے علاوہ ''بِاِذْنِیْ'' کی چار مرتبہ تکرار ہے اور سورۃ آل عمران میں دو دفعہ ''بِاِذْنِ اللّٰهِ'' کہا گیا؟ اس بات کی توجیہہ یوں کی جاسکتی ہے کہ سورۃ آل عمران میں اصل مقصود حضرت مریم سلام علیہا کو خوشخبری دینا ہے اور انہیں یہ بتانا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو اپنے بحیثیت رسول بھیجے جانے' معجزات کے ساتھ تائید الٰہی کا حامل ہونے اور اپنی ذاتی قدرت کی نفی کرنے کی تبلیغ کریں گے۔ چنانچہ آپ کی یہ ساری باتیں نقل کی گئیں جن میں سوائے خوشخبری اور معجزات کے ذکر کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ لیکن سورۃ المائدۃ میں گو یہی معجزات ذکر کیے گئے ہیں لیکن کلام کا مقصد بالکل جدا ہے' یہاں گو مخاطب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں لیکن مقصود ہے عیسائیوں کو ملامت کرنا اور جو باتیں انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گھڑی ہیں' ان پر انہیں سرزنش کرنا' اور اس کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر عتاب کیا جا رہا ہے لیکن وہ عتاب ان پر نہیں ہے' بلکہ ان کو خطاب کر کے ان لوگوں کو جھنجھوڑا جا رہا ہے جنہوں نے بجائے اللہ تعالیٰ کے عیسیٰ علیہ السلام کو پوجنا شروع کر دیا۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی نعمتوں کے بیان میں دراصل بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک آقا اپنے ایک محبوب غلام سے جو اس کی نافرمانی کی تاب بھی نہیں لاسکتا' اس طرح خطاب کرے: کیا میں نے تمہارے لیے یہ کچھ نہیں کیا؟ کیا میں نے تمہیں یہ کچھ نہیں دیا؟ اور پھر اپنے کئی احسانات گنوانے کے بعد کہے: کیا کوئی دوسرا یہ سب کچھ کرسکتا تھا؟ اگر میں تمہیں نہ دیتا تو کیا تم فلاں شخص پر احسان کرسکنے کے قابل تھے؟ اگر میں تمہاری مدد نہ کرتا تو کیا تم اپنے دشمن کو زیر کرسکتے تھے؟ آقا یہ سب کچھ اس لیے کررہا ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہ ہو کہ اگر اس غلام نے کسی پر احسان کیا ہے یا کسی دشمن کو مار بھگایا ہے' تو وہ اس کی اپنی طاقت کی وجہ سے تھا نہ کہ اس کے آقا کی بنا پر!! آقا کے کہنے پر جب غلام اس کی بات پر صاد کرتا ہے تو ہر اُس شخص کا منہ بند ہو جاتا ہے جو اُس کے برخلاف سمجھ رہا تھا اور غلام ہی کو صاحبِ اقتدار جان رہا تھا۔ (یہ مثال سمجھانے کی غرض سے دی گئی ہے وگرنہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی مثال کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔)

تو یہاں بھی خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے لیکن مقصود نصاریٰ کو تنبیہہ کرنا ہے۔ یہاں چار نعمتوں کا ''بِاِذْنِیْ'' کے ساتھ چار مرتبہ ذکر کیا گیا اور یہ وہ چار باتیں ہیں کہ جن کی بنا پر نصاریٰ راہِ راست سے بھٹک گئے' یعنی پرندہ کی شکل بنانا اور پھونک مارنے سے اس کا زندہ ہو جانا' مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو شفا بخشنا' مردے کو زندہ کرنا۔ اور پھر انہوں نے تثلیث کی راہ اپنالی' لیکن اللہ بے نیاز ہے اور ان کے قول سے کہیں بالاتر ہے:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ﴾ (المؤمنون:۹۱)

''اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی الٰہ ہے۔''

اور اس طرح یہ واضح کردیا کہ نبی خود اقرار کررہا ہے کہ یہ تمام باتیں اُس کی طرف سے نہیں' بلکہ اللہ کی طرف سے ہوئی ہیں' اس کی اپنی قدرت و طاقت کا اس میں کوئی دخل نہ تھا بلکہ سب کچھ اللہ کے اذن سے ہوا۔ اور پھر اگلی آیات میں اس مقصد کو مزید کھول کر رکھ دیا۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... الخ﴾ (المائدۃ:۱۱۶۔۱۱۹)

''اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو الٰہ بنالینا؟.....''

یہاں دراصل نصاریٰ ہی کو ملامت کرنا اور ان کو سرزنش کرنا مقصود ہے' کہ دیکھو عیسیٰ جس کو تم ابن اللہ مان رہے ہو' وہ کیا کہتا ہے:

﴿مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ۭ﴾

''میں وہ بات کیسے کرسکتا ہوں جو میرے لیے حق نہیں ہے!''

﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ﴾

''اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تُو نے اسے جان لیا ہوتا!''

یہاں وہ اپنے رب کی شرک سے تنزیہہ کررہے ہیں' لوگوں نے جو کچھ ان کی طرف منسوب کیا ہے اس کی نفی کررہے ہیں اور اپنے رب کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں۔ تو اب یہ واضح ہوگیا کہ دونوں سورتوں کا

مقصد مختلف تھا' اس لیے عبارت میں بھی اختلاف ہوا۔ سورۃ آل عمران میں حضرت مریم سلام علیہا کے لیے کچھ خبریں ہیں اور بشارت بھی' جبکہ سورۃ المائدۃ میں نصاریٰ کو سرزنش کرنا مقصود ہے۔

(۵۱) آیت ۵۱:

﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾

''بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے تو اس کی عبادت کرو۔''

اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾ (آیت ۳۶)

اور سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾ (آیت ۶۴)

تینوں آیات میں مضمون ایک ہی ہے۔

پہلی اور تیسری آیت میں' شروع میں حرف عطف (واؤ) نہیں ہے اور تیسری آیت میں ''هُوَ'' کا اضافہ ہے۔ دوسری آیت میں' شروع میں حرفِ عطف ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے —— واللہ اعلم —— کہ سورۂ مریم میں عیسیٰ علیہ السلام کی چند باتیں بیان کی گئی ہیں' جیسے پنگھوڑے میں ان کا کلام کرنا' ان کا نبی ہونا' صاحبِ کتاب ہونا' بابرکت ہونا۔ فرمایا:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا.....الخ﴾

اور پھر آخر میں اپنے یومِ ولادت' یومِ وفات اور دوبارہ اٹھائے جانے والے دن' ان پر سلامتی کا ذکر ہے:

﴿وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾﴾

اس طرح اپنے تین احوالِ بشریہ (زندگی' موت اور بعث) میں کرامت کا اظہار ارشاد فرمایا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ربّ ہے اور وہ ان بشری احوال سے بے نیاز ہے۔ خود ان کے لیے بحیثیت انسان کے ان احوال کی بنا پر ان کی بشریت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا بلکہ ان کی فضیلت بڑھ جاتی ہے' گویا وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں ان معجزات کی بنا پر ربوبیت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا' کیونکہ وہ تو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے' چنانچہ اپنی بات کو دو آیتوں کے فصل کے ساتھ واو العطف سے جوڑ دیا اور کہا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾ (مریم:۳۶)

وہ دو آیتیں جو بیچ میں آ گئیں وہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحیثیت تعریفی کلمات تھیں' فرمایا:

﴿ذٰلِكَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۳۵﴾﴾

''یہ ہے اصل (حقیقت) عیسیٰ ابن مریم کی' یہ وہ حق بات ہے جس میں وہ شک کرتے ہیں۔ اللہ کے لیے یہ لائق نہیں کہ وہ بیٹا بنائے' اس کی ذات اس سے پاک ہے۔ وہ تو جب کوئی چیز چاہتا ہے تو کہتا ہے 'ہو جا'

تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اب دیکھئے کہ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾

چونکہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے اور اس کا سرا ان کے آخری قول ﴿وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾﴾ سے جڑتا ہے اس لیے واو العطف لانا ضروری تھا تاکہ کلام کا تسلسل باقی رہے۔

سورۃ آل عمران میں جہاں یہ آیت آئی ہے وہاں بیچ میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے ربط کلام ٹوٹتا ہو کہ واو العطف کی ضرورت پڑے۔ واللہ اعلم!

اب رہا سورۃ الزخرف میں ضمیر ''ھُوَ'' کا لایا جانا تو اسے جاننے کے لیے سیاق و سباق کو دیکھنا ہوگا۔ آیت ۵۷ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ یَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾﴾

''اور جب ابن مریم کی مثال بیان کی جاتی ہے تو تیری قوم (خوشی سے) چیخنے لگتی ہے۔''

مراد یہ ہے کہ کفار خوشی اسی لیے منا رہے ہیں کہ تمہارا کہنا تو یہ تھا کہ جس جس کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے وہ جہنم میں پھینکا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بھی عبادت کی گئی ہے اور وہ ہمارے خداؤں سے بہتر تو نہیں ہیں اس لیے وہ بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کے اس زعم کا جواب سورۃ الانبیاء میں دے دیا گیا ہے' جہاں یہ فرمایا گیا تھا:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾﴾

''تم بھی اور جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو' سب جہنم کا ایندھن بنو گے اور تم سب وہاں داخل ہونے والے ہو۔''

پھر ان کے اس شبہ کا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کی بھی تو عبادت کی گئی ہے' تو وہ بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے' یوں جواب دیا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾

''البتہ بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی لکھی جا چکی ہے وہ سب جہنم سے دور ہی رہیں گے۔''

سورۃ الزخرف میں کفار کا خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے معبودوں کے مقابلے میں ''ھُوَ'' کی ضمیر سے اشارہ کیے جانے کا ذکر تھا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ضمن میں ''ھُوَ'' کی ضمیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا۔ یعنی تمہارا اعتقاد ہے کہ میں بھی تمہارے نام نہاد خداؤں کے ساتھ باعث عبادت بنا ہوں اور مجھے بھی الٰہ کہا گیا ہے اور پھر میرا تقابل تمہارے خداؤں (لات' منات' ھُبل) کے ساتھ کیا جا رہا ہے تو جان لو کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۴﴾﴾ (الزخرف)

''بے شک اللہ وہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے تو اسی کی عبادت کرو' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔''

گویا انہوں نے ''ھُوَ'' کہہ کر حضرت عیسیٰؑ کو خداؤں کے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی اور حضرت عیسیٰؑ نے ''ھُوَ'' سے اللہ کی طرف اشارہ کر کے ان کی بات کا ابطال کر دیا۔ اور چونکہ سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں ان کے خداؤں کا ذکر نہیں تھا اس لیے وہاں یہ ضمیر منفصل نہیں لائی گئی۔

سورۃ النجم میں بھی اسی طرز پر اللہ کی چار صفات کے ساتھ ''ھُوَ'' کی اضافی ضمیر لائی گئی ہے' وہ آیات یہ ہیں:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾﴾

اور پھر بعد میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾﴾

اور ان تین آیات میں یہ ضمیر نہیں لائی گئی:

﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾﴾

﴿وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾﴾

﴿وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨ الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾﴾

اور جس طرح ان آیات میں ''ھُوَ'' کی ضمیر لانے کا مقصد ہے اسی طرح سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۷ میں اللہ کے ذکر میں ''اَنْتَ'' کی ضمیر منفصل لائی گئی ہے:

﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ﴾

''اور جب تم نے مجھے اٹھا لیا تو تُو ہی ان پر نگران تھا۔''

ہم اس موضوع پر سورۃ النجم میں تفصیلاً بیان کریں گے۔

(مؤلف نے دوسری جلد میں سورۃ النجم کی دوسری آیات پر کلام کیا ہے لیکن متذکرہ آیات کا تذکرہ کرنا بھول گئے جن کا وعدہ کیا گیا تھا' اس لیے ہم اختصار کے ساتھ سورۃ النجم کی ان آیات کا ابن عاشور کی تفسیر کی روشنی میں خلاصہ پیش کرتے ہیں: از مترجم)

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾﴾ ''اور وہی ہے جس نے ہنسایا اور رلایا۔''

اس سے قبل رب کے تصرفات کا ذکر تھا:

﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾﴾ ''اور تیرے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے۔''

اور پھر رب کی طرف (وَاَنَّهٗ هُوَ) کی ضمیر لا کر رب کے ان تصرفات کی طرف اشارہ کیا جو اس کی مرضی سے وجود میں آتے ہیں۔

''ھُوَ'' کی ضمیر قصرِ افراد کے معنی میں ہے' یعنی یہ صرف اللہ کی ذات ہے جو اس کام پر قادر ہے' یعنی انسان کے جذبات کا اتار چڑھاؤ' جس میں اس کا ہنسنا اور رونا بھی شامل ہے' صرف اللہ ہی اس پر قادر ہے' پھر فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾﴾ ''اور وہی ہے جو مارتا ہے اور زندگی دیتا ہے۔''

کفار چونکہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ صرف زمانہ ہی ہے جس کی گردش ان کی ہلاکت کی باعث بنتی ہے ﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾(الجاثیۃ:۲۴) ' تو ان کی بات کا رد کیا گیا کہ نہیں یہ صرف اللہ کی ذات ہے جو موت اور حیات بخشتی ہے۔ یہاں زندگی سے مراد دنیوی زندگی ہے' آخرت میں اٹھایا جانا نہیں ہے' چونکہ مقصود کفار کے عقیدے کی تردید ہے' البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بعث بعد الموت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾﴾

''اور اسی نے جوڑے' مرد و عورت پیدا کیے' ایک نطفہ سے جب اسے ٹپکایا گیا۔''

یہاں ''هُوَ'' کی ضمیر کا اعادہ نہیں کیا گیا' کہ کفار اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں شک نہیں کرتے تھے۔

﴿وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾﴾ ''اور اسی کے ذمہ ہے دوبارہ پیدا کرنا۔''

پہلے دنیا کی زندگی اور موت کا تذکرہ تھا تو اسی کے تسلسل کے لیے یہ بھی بتا دیا کہ وہی پھر دوبارہ زندگی بھی عطا کرے گا۔ اگلی دو آیات میں ''هُوَ'' کی ضمیر کا اعادہ کیا جا رہا ہے' فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾﴾

''اور وہی ہے جو مالدار بناتا ہے اور (اتنا دیتا ہے کہ) اسے راضی کر دیتا ہے۔''

نعمتِ خلق کے بعد نعمتِ رزق کی طرف اشارہ ہے' جیسے دوسری آیات میں ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ﴾ (الروم:۴۰)

''اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پھر تمہیں رزق دیا۔''

اور ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا:

﴿الَّذِىْ خَلَقَنِىْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِىْ هُوَ يُطْعِمُنِىْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾﴾ (الشعراء)

''جس نے مجھے پیدا کیا تو وہی مجھے ہدایت دیتا ہے اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔''

لوگ عام طور پر اس نعمت کے دینے والے سے غافل رہتے ہیں اس لیے ''هُوَ'' کی ضمیر لا کر یاد دلایا جا رہا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو تمہیں مال و دولت سے نوازتا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾﴾ ''اور وہی شعریٰ ستارے کا رب ہے۔''

شعریٰ (Sirius) بہت روشن ستارہ ہے جسے عرب قبائل میں سے خاص طور پر خزاعہ قبیلے نے پوجا۔ اس کی عبادت کی طرف پہلے پہل جس شخص نے دعوت دی اس کی کنیت ابو کبشہ تھی۔ نام میں اختلاف ہے' جزء بن غالب یا غبشان بتایا جاتا ہے۔ شق القمر کے معجزے کے ظہور کے وقت کفار نے رسول اللہ ﷺ کو ابو کبشہ کے نام سے یاد کیا اور کہا: سَحَرَكم ابن ابی كَبْشَه ''ابو کبشہ کے بیٹے نے تم پر جادو کر دیا ہے۔'' گویا جس طرح ابو کبشہ نے ان کے خداؤں (لات' منات' ہُبل) کے مقابلے میں ایک دوسرا خدا کھڑا کر دیا ہے' اسی طرح محمد (ﷺ) نے بھی ایک نیا معبود گھڑ لیا ہے۔ یہاں بھی هُوَ کی ضمیر لا کر واضح کیا جا رہا ہے کہ تم شعریٰ کو ربّ مانتے ہو اور رزق اور بارش کے برسنے کو اس کی طرف منسوب کرتے ہو تو یہ بات غلط ہے' شعریٰ تو خود مامور

ہے' وہ تو اللہ کے حکم کا پابند ہے جو اس کا ربّ ہے۔اس طرح اس سورت میں پہلے ان خیالی دیوتاؤں (لات' منات' ہبل) کی عبادت کا ابطال کیا گیا' پھر فرشتوں کی الوہیت کی نفی کی گئی اور آخر میں ستاروں کے خدا ہونے کے نظریہ کا رد کیا گیا ہے۔(اھ)

---

(۵۲) آیت ۵۲:

﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝۵۲﴾

''جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ انکار کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا: کون میرا مددگار بنے گا اللہ کی طرف! تو حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔''

اور سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۝۱۱۱﴾

''جب میں نے حواریوں پر وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ' تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔''

سورۂ آل عمران کی آیت میں ''بِاَنَّا'' میں ایک نون محذوف ہے' یعنی تخفیف کے ساتھ ہے اور سورۃ المائدۃ میں ''بِاَنَّنَا'' میں نون کا اثبات ہے۔گو دونوں طرح جائز ہے لیکن ایک میں ''ن'' کا ہونا اور دوسرے میں نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ جواباً عرض ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ المائدۃ میں ایمان لائے جانے کے بارے میں تفصیلی ذکر ہے' کہا: ﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ﴾۔ تو جہاں تفصیل ہوگی وہاں عبارت میں بھی وسعت کلام ہوگا' اس لیے مناسب تھا کہ یہاں نون کا اثبات کیا جاتا۔سورۂ آل عمران میں صرف اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہے' بِرَسُوْلِهٖ کا ذکر نہیں ہے کہ وہ سیاق وسباق سے ظاہر ہے' تو جہاں اختصار ہوگا وہاں نون کا حذف کرنا بھی مناسب ہوگا۔اور اس کا عکس مناسب نہ تھا۔اس لیے ہر دو سورتوں میں ''ن'' کا ہونا یا نہ ہونا اپنی اپنی جگہ پر ہے' واللہ اعلم!

(۵۳) آیت ۸۶:

﴿كَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾

''اللہ ایسی قوم کو کیسے ہدایت دے گا جنہوں نے اپنے ایمان لانے کے بعد اور اس گواہی کے بعد کہ رسول حق ہیں' کفر کیا۔''

اور سورۃ البراءۃ (التوبۃ) کی آیت ۷۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ﴾

''اور انہوں نے کفریہ کلمہ کہا اور اپنے اسلام لانے کے بعد کفر کیا''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دونوں سورتوں میں مضمون ایک ہی تھا کہ انہوں نے قبولیت اور اطاعت کے بعد کفر کیا تھا تو سورۃ آل عمران میں ایمان کا اور سورۃ التوبہ میں اسلام کا کیوں ذکر کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر دو سورت میں قصہ مختلف ہے۔ آل عمران کی آیت الحارث بن سوید الانصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور پھر کافروں سے جا ملا تھا' پھر وہ اپنے کیے پر نادم ہوا اور اپنی قوم کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ تک پیغام پہنچایا کہ آیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ تو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا تو یہ آیت اتری' اور انہوں نے ساری بات اسے لکھ بھیجی تو وہ دوبارہ اسلام لے آیا اور ٹھیک ٹھاک مسلمان رہا۔ اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ اس نے منافقت سے کام نہیں لیا' نہ ہی ظاہر میں وہ بات کی جو اس کے باطن میں نہ تھی' یعنی اس کی حالت ایک مؤمن کی سی رہی نہ کہ ایک منافق کی۔

اب رہی سورۃ التوبہ کی آیت تو وہ الجلاس بن سوید بن الصامت کے بارے میں نازل ہوئی جس نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کہا تھا: ''اگر جو کچھ محمد کہتے ہیں حق ہے تو ہم تو گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔'' یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے اسے بلایا اور اس بارے میں پوچھا تو وہ قسم کھا کے انکار کرنے لگا' اور اس کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ منافق ہے' اسلام کا اظہار کرتا ہے لیکن باطن میں کافر ہے' تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل کی:

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ﴾

''وہ قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کے نام کی کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا' حالانکہ انہوں نے کفریہ کلمہ کہا تھا اور اسلام لانے کے بعد کفر کا ارتکاب کیا تھا۔''

یہاں ''ان کے اسلام'' کا ذکر کیا کہ اسلام بظاہر مان لینے کو کہا جاتا ہے چاہے ایسے شخص کے دل میں ایمان نہ بھی ہو' جیسے کہ سورۃ الحجرات میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۴)

''بدو لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو' لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں' ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔''

روایت ہے کہ الجلاس اس کے بعد مسلمان ہو گیا تھا اور پھر اچھا مسلمان رہا۔ تو معلوم ہوا کہ ہر دو آیات میں جو لفظ وارد ہوا ہے وہ قصے کے اختلاف کی بنا پر بالکل اپنی جگہ پر واقع ہوا ہے۔ یہ قصے مفسرین اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔

(۵۴) آیت ۱۱۷:

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷﴾

''اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

اور سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳﴾

''لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کیا کرتے تھے۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں موضوع ایک ہے اور مقصد بھی ایک ہے' لیکن سورۃ النحل کی آیت میں ''کَانُوْا'' کا اضافہ ہے جبکہ سورۃ آل عمران میں ''کَانُوْا'' نہیں لایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ آل عمران کی آیت نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو کہ آیت کے نزول کے وقت موجود تھے' اسی لیے ان کے بارے میں ''کَانَ'' کا لانا مناسب نہ تھا جو کہ ماضی کے واقعات پر دلالت کرتا ہے' اور سورۃ النحل کی آیت پچھلے لوگوں کے بارے میں تھی جو کہ گزر چکے تھے اور دوسروں کو ان کے حال سے نصیحت دلانا مقصود تھی۔ اسی لیے وہاں پر فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ﴾

''اور اس طرح کیا اُن لوگوں نے جو اُن سے پہلے تھے''

پھر فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۳۳﴾

تو جہاں ماضی کا قصہ تھا وہاں ''کَانُوْا'' لایا گیا اور جہاں ''حال'' کا تذکرہ تھا' وہاں ''کَانُوْا'' کا لانا مناسب نہ تھا' واللہ اعلم!

(۵۵) آیت ۱۲۶:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۝۱۲۶﴾

''اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر تمہارے لیے ایک بشارت اور اس لیے کہ تمہارے دل اس سے اطمینان حاصل کر سکیں' اور نصرت تو اللہ ہی کی طرف سے ہے جو طاقت والا' حکمت والا ہے۔''

اور سورۃ الانفال میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝۱۰﴾

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس لیے کہ دونوں آیتوں کا مقصد بظاہر ایک ہی ہے اور دونوں آیتیں اہلِ بدر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں:

(۱) سورۃ آل عمران میں ''لَكُمْ'' کا اضافہ ہے' سورۃ الانفال میں یہ لفظ نہیں ہے۔

(۲) سورۃ آل عمران میں ''بِهٖ'' (جار مجرور) سے قبل ''قُلُوْبُكُمْ'' لایا گیا۔ سورۃ الانفال میں اس کے برعکس ہے۔

(۳) سورۃ الانفال میں اللہ کی دونوں صفات سے قبل ''اِنَّ'' لا کر تاکید کی گئی ہے جبکہ سورۃ آل عمران میں ایسا نہیں ہے۔

پہلے دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ آل عمران میں دو گروہوں کا ذکر ہے' ایک تو مسلمانوں کا اور دوسرے ان کے دشمنوں کا جن کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا تھا: ﴿وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ﴾

(اور وہ فوراً ہی چلے آئیں) تو ''بُشْرٰی لَکُمْ'' کہہ کر واضح کر دیا گیا کہ یہ بشارت دونوں گروہوں میں سے صرف تمہارے لیے ہے اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ بشارت اس لیے ہے تاکہ تمہارے دل اس خوشخبری سے مطمئن ہوسکیں۔ یہاں ''قُلُوْبُکُمْ'' کا ذکر جار مجرور سے پہلے کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے اطمینانِ قلب کا خاص طور پر امتیازی بیان ہوجائے۔

اس کے برعکس سورۃ الانفال میں کفار کا ذکر نہیں ہے اس لیے بُشْرٰی کے بعد ''لَکُمْ'' کے ذکر کی ضرورت نہ تھی اور پھر اس سورت میں تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ دو جماعتوں (قافلہ قریش اور جیش قریش) میں سے ایک جماعت تمہارے ہاتھ لگے گی' فرمایا:

﴿وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ﴾ (آیت ۷)

''اور یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے ہاتھ لگے گی''

تو وہاں ''لَکُمْ'' کہہ کر اس بشارت کا ان کے ساتھ خاص ہونے کا ذکر پہلے ہی آ چکا تھا اس لیے اس کا اعادہ کرنا مناسب نہ تھا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ آیت الانفال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم الشان وعدے کیے گئے تھے:

﴿وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ﴾ (آیت ۷)

پھر فرمایا:

﴿وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ ۙ﴿۷﴾﴾

''اور اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

اور پھر دوبارہ ارشاد فرمایا:

﴿لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ۸﴿۸﴾﴾

''تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دے چاہے مجرمین اسے ناپسند کیوں نہ کریں۔''

یہ ہیں وہ عظیم الشان وعدے کہ ان کا ذکر سورۃ آل عمران میں نہ تھا' اس لیے مناسب تھا کہ سورۃ الانفال میں' جہاں یہ وعدے کیے گئے ہیں' اللہ کی دونوں صفاتِ جلیلہ' عزیز و حکیم سے قبل اِنَّ لا کر اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت اور حکمت کو بتاکید بیان کیا جائے۔ اور یوں دونوں آیات میں ''اِنَّ'' کا لایا جانا یا حذف کیا جانا اپنی اپنی جگہ پر مناسب تھا' واللہ اعلم!

تصحیح: گزشتہ شمارے میں (صفحہ ۱۲ پر) عبدالرحمٰن کیلانی کی کتاب کا نام ''مترادفات القرآن'' کے بجائے سہواً ''مفردات القرآن'' چھپ گیا ہے۔ اس غلطی پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الاعراف

آیات ۴۰ تا ۴۳

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَا لَا تُفَتَّحُ لَہُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ
حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾ لَہُمۡ مِّنۡ جَہَنَّمَ مِہَادٌ
وَّمِنۡ فَوۡقِہِمۡ غَوَاشٍ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا
نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ
صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ ۚ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ہَدٰىنَا لِہٰذَا ۟ وَمَا
کُنَّا لِنَہۡتَدِیَ لَوۡلَاۤ اَنۡ ہَدٰىنَا اللّٰہُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَنُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ
اُوۡرِثۡتُمُوۡہَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾

ج م ل

جَمُلَ یَجۡمُلُ (ک) جَمَالًا: خوبصورت ہونا' خوب سیرت ہونا۔

جَمَالٌ (اسم ذات بھی ہے): خوبصورتی۔ ﴿وَلَکُمۡ فِیۡہَا جَمَالٌ﴾ (النحل:٦) ''اور تمہارے لیے اس میں خوبصورتی ہے۔''

جَمِیۡلٌ (فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت): خوبصورت' خوب سیرت۔ ﴿فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ ﴿۸۵﴾﴾ (الحجر) ''پس تُو نظر انداز کر' خوب صورت نظر انداز کرنا۔''

جَمَلٌ (ج) جِمَالَۃٌ: اونٹ۔ ﴿کَاَنَّہٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴿۳۳﴾﴾ (المرسلات) ''جیسے کہ وہ ہوں زرد اونٹ۔''

جَمَلَ یَجۡمُلُ (ن) جَمۡلًا: جمع کرنا' اکٹھا کرنا۔

جُمْلَةٌ :اکٹھی کی ہوئی چیز۔﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ (الفرقان:۳۲) ''کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن اکٹھا ایک بار۔''

س م م

سَمَّ يَسُمُّ (ن) سُمُوْمًا :جھلسنا۔

سَمُوْمًا:جھلس دینے والی گرم ہوا' لُو۔﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (الحجر) ''اور جن! ہم نے پیدا کیا اس کو اس سے پہلے لُو کی آگ سے۔''

سَمٌّ :تنگ سوراخ' جیسے سوئی کا ناکا۔زیر مطالعہ آیت ۴۰۔

ترکیب

(آیت ۴۱) ''مِهَادٌ'' اور ''غَوَاشٍ'' مبتدأ موخر نکرہ ہیں' ''لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ'' ان دونوں کی قائم مقام خبر مقدم ہے۔ جبکہ ''وَمِنْ فَوْقِهِمْ''،''غَوَاشٍ'' کی متعلق خبر ہے۔ (آیت ۴۲) ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' مبتدأ ہے اور ''اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ'' اس کی خبر ہے' درمیان میں ''لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' جملہ معترضہ ہے۔ آیت ۴۳ سے شروع ہو کر آگے کئی آیات تک قیامت کا ذکر ہے۔ اس لیے ان آیات میں افعالِ ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ :بے شک جن لوگوں نے	كَذَّبُوْا :جھٹلایا
بِاٰيٰتِنَا :ہماری نشانیوں کو	وَاسْتَكْبَرُوْا :اور گھمنڈ کیا
عَنْهَا :ان سے	لَا تُفَتَّحُ :نہیں کھولے جائیں گے
لَهُمْ :ان کے لیے	اَبْوَابُ السَّمَآءِ :آسمان کے دروازے
وَلَا يَدْخُلُوْنَ :اور نہ ہی وہ داخل ہوں گے	الْجَنَّةَ :جنت میں
حَتّٰى :یہاں تک کہ	يَلِجَ :گھس جائے
الْجَمَلُ :اونٹ	فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ :سوئی کے ناکے میں
وَكَذٰلِكَ :اور اس طرح	نَجْزِي :ہم بدلہ دیتے ہیں
الْمُجْرِمِيْنَ :جرم کرنے والوں کو	لَهُمْ :ان کے لیے
مِّنْ جَهَنَّمَ :جہنم میں سے ہے	مِهَادٌ :ایک بچھونا
وَّمِنْ فَوْقِهِمْ :اور ان کے اوپر سے	غَوَاشٍ :کچھ چھا جانے والی چیزیں
وَكَذٰلِكَ :اور اس طرح	نَجْزِي :ہم بدلہ دیتے ہیں
الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والوں کو	وَالَّذِيْنَ :اور جو لوگ
اٰمَنُوْا :ایمان لائے	وَعَمِلُوا :اور انہوں نے عمل کیا
الصّٰلِحٰتِ :نیک	لَا نُكَلِّفُ :ہم پابند نہیں کرتے

نَفْسًا : کسی جان کو
وُسْعَهَآ : اس کی وسعت کو
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ : جنت والے ہیں
فِيْهَا : اس میں
وَنَزَعْنَا : اور ہم کھینچ نکالیں گے
فِيْ صُدُوْرِهِمْ : ان کے سینوں میں ہے
تَجْرِيْ : بہتی ہوں گی
الْاَنْهٰرُ : نہریں
الْحَمْدُ : تمام شکر و تعریف
الَّذِيْ : جس نے
لِهٰذَا : یہاں تک
لِنَهْتَدِيَ : کہ ہم ہدایت پاتے
اَنْ : کہ
اللّٰهُ : اللہ
رُسُلُ رَبِّنَا : ہمارے رب کے رسول
وَنُوْدُوْٓا : اور پکارا جائے گا
تِلْكُمُ الْجَنَّةُ : یہ جنت
بِمَا : بسبب اس کے جو
اِلَّا : مگر
اُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ
هُمْ : یہ لوگ
خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں
مَا : اس کو جو
مِّنْ غِلٍّ : کسی قسم کی کوئی کدورت
مِنْ تَحْتِهِمُ : ان کے نیچے سے
وَقَالُوا : اور وہ کہیں گے
لِلّٰهِ : اللہ ہی کے لیے ہے
هَدٰىنَا : پہنچایا ہم کو
وَمَا كُنَّا : اور ہم نہیں تھے
لَوْلَآ : اگر نہ ہوتا
هَدٰىنَا : ہم کو ہدایت دیتا
لَقَدْ جَآءَتْ : البتہ تحقیق آ چکے تھے
بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ
اَنْ : کہ
اُوْرِثْتُمُوْهَا : تم لوگوں کو وارث بنایا گیا اس کا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : تم لوگ کرتے تھے

نوٹ ۱: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن بندہ کے لیے جب موت کا وقت آتا ہے تو حضرت عزرائیل علیہ السلام اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ رب کی مغفرت کے لیے نکلو۔ اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزے کا منہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے۔ اس کی روح کو لے کر فرشتے پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ عِلِّیِّیْن میں رکھو اور اس کو واپس کر دو۔ پھر یہ روح لوٹ کر قبر میں آتی ہے' سوال و جواب کے لیے۔ (اس کے برعکس) کافر کا جب موت کا وقت آتا ہے تو فرشتۂ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اور اس میں سے کھینچی جائے۔ اس کی روح کو لے کر فرشتے پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں تو اس کا دروازہ نہیں کھولا جاتا' بلکہ حکم ہوتا ہے کہ اس بندے کا اعمال نامہ سِجِّیْن میں رکھو اور اس کو واپس کر دو۔ پھر یہ روح لوٹ کر قبر میں سوال و جواب کے لیے آتی ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: حکایات (Case Studies) میں جو واقعات ہوتے ہیں' عام طور پر وہ فرضی ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد اور افادیت یہ ہوتی ہے کہ کسی بات کو ایک واقعاتی شکل دینے سے وہ بات سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو جاتا ہے۔

ہمارے استادمحترم حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے ایسی ہی ایک حکایت اپنے طلبہ کو سنائی تھی جو ان کے ترجمۂ قرآن کیسٹ میں محفوظ ہے۔اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اسے نقل کر رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ دوزخی لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس گئے اور درخواست کی کہ ہم اپنے کیے کی بہت سزا بھگت چکے' اب تُو ہمیں معاف کر دے اور اپنی رحمت سے ہمیں بھی جنت میں داخل کر دے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے لیے تم لوگوں کو ایک کام کرنا ہو گا۔ واپس جاؤ اور تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو بغض' کینہ' کدورت وغیرہ ہے' وہ سب دل سے نکال کر اور ایک دوسرے کو معاف کر کے واپس آؤ' تو میں تم لوگوں کو جنت میں داخل کر دوں گا۔ واپس آ کر انہوں نے سوچا کہ اگر میں نے اس کو معاف کر دیا تو میرا یہ دشمن بھی جنت میں چلا جائے گا' اس کو تو میں کسی قیمت پر جنت میں نہیں جانے دوں گا' خواہ مجھے خود بھی دوزخ میں رہنا پڑے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے کسی کو معاف نہیں کیا اور سب کے سب دوزخ میں پڑے رہے۔

اس حکایت میں ہمارے لیے کئی سبق ہیں' جن میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ خود بھی غفور (بے انتہا بخشنے والا) ہے اور وہ معاف کرنے کے عمل کو پسند کرتا ہے۔ (۲) معاف کرنے کا فائدہ پہلے معاف کرنے والے کی ذات کو ہوتا ہے اس کے بعد وہ کسی اور کو منتقل ہوتا ہے' جبکہ معاف نہ کرنے والا اور انتقام کی فکر کرنے والا پہلے اپنا نقصان کرتا ہے اس کے بعد ہی وہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ (۳) کسی معاشرے میں جب عفو و درگزر رواج پاتا ہے تو وہ معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے' جبکہ کسی معاشرے میں اگر انتقام لینا ضروری قرار پا جائے تو وہ معاشرہ انتشار اور بدامنی کا شکار ہو جاتا ہے۔

آیات ۴۴ تا ۵۱

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْٓا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

ح ج ب

حَجَبَ یَحْجُبُ (ن) حَجْبًا :دو چیزوں کے درمیان حائل ہوکر ایک دوسرے تک پہنچنے سے روکنا۔ (۱) حائل ہونا۔(۲) روکنا۔

حِجَابٌ (اسم ذات): پردہ‘اوٹ‘رکاوٹ۔زیرمطالعہ آیت ۴۶۔

مَحْجُوْبٌ (اسم المفعول) : روکا ہوا۔ ﴿اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾(المطففین) ''بے شک وہ لوگ اپنے رب سے اس دن روکے ہوئے ہوں گے۔''

ترکیب

(آیت ۴۴‘۴۵) ''وَجَدْنَا'' کا مفعولِ اوّل ''مَا'' ہے اور ''حَقًّا'' مفعولِ ثانی ہے۔''اَلَّذِیْنَ'' بدل ہے ''الظّٰلِمِیْنَ'' کا۔(آیت ۴۶) ''رِجَالٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور نکرہ مخصوصہ بھی ہے۔اس کی خبر ''مَوْجُوْدٌ'' محذوف ہے۔''عَلَی الْاَعْرَافِ'' قائم مقام خبر مقدم جبکہ ''یَعْرِفُوْنَ'' اس کی خصوصیت ہے۔''نَادَوْا'' کا فاعل اس میں ''ھُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''رِجَالٌ'' کے لیے ہے۔ (آیت ۴۷) ''صُرِفَتْ'' کا نائب فاعل ''اَبْصَارُھُمْ'' ہے جبکہ ''تِلْقَاءَ'' ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ:

وَنَادٰٓی :اور پکاریں گے

اَصْحٰبَ النَّارِ :آگ والوں کو

قَدْ وَجَدْنَا :ہم نے پایا ہے

وَعَدَنَا :وعدہ کیا ہم سے

حَقًّا :برحق

وَجَدْتُّمْ :تم لوگوں نے پایا

وَعَدَ :وعدہ کیا

حَقًّا :برحق

نَعَمْ :ہاں

مُؤَذِّنٌ :ایک پکارنے والا

اَنْ :کہ

عَلَی الظّٰلِمِیْنَ :ظلم کرنے والوں پر

یَصُدُّوْنَ :روکتے ہیں

وَیَبْغُوْنَهَا :اور جو تلاش کرتے ہیں اس میں

وَهُمْ :اور یہ لوگ

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ :جنت والے

اَنْ :کہ

مَا :اس کو جو

رَبُّنَا :ہمارے رب نے

فَهَلْ :تو کیا

مَّا :اس کو جو

رَبُّكُمْ :تمہارے رب نے

قَالُوْا :وہ کہیں گے

فَاَذَّنَ :پھر پکارے گا

بَیْنَهُمْ :ان کے مابین

لَّعْنَةُ اللّٰهِ :اللہ کی لعنت ہے

الَّذِیْنَ :وہ لوگ جو

عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ :اللہ کے راستے سے

عِوَجًا :کجی کو

بِالْاٰخِرَةِ :آخرت کا

كٰفِرُوْنَ :انکار کرنے والے ہیں
حِجَابٌ :ایک رکاوٹ ہے
رِجَالٌ : کچھ لوگ ہیں
كُلًّا :سب کو
وَنَادَوْا :اور وہ پکاریں گے
اَنْ : کہ
عَلَيْكُمْ :تم پر
وَهُمْ :اور وہ
وَاِذَا :اور جب کبھی
اَبْصَارُهُمْ :ان کی نگاہیں
قَالُوْا :تو وہ کہیں گے
لَا تَجْعَلْنَا : تو مت بنانا ہمیں
وَنَادٰٓى :اور پکاریں گے
رِجَالًا : کچھ لوگوں کو
بِسِيْمٰهُمْ :ان کی نشانی سے
مَآ اَغْنٰى :کام نہ آئی
جَمْعُكُمْ :تمہاری جتھہ بندی
كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ:تم لوگ گھمنڈ کرتے تھے
الَّذِيْنَ :وہ لوگ جن کی
لَا يَنَالُهُمْ :(کہ) نہیں پہنچے گا ان کو
بِرَحْمَةٍ :کسی رحمت سے
الْجَنَّةَ :جنت میں
عَلَيْكُمْ :تم پر
تَحْزَنُوْنَ :پچھتاؤ گے
اَصْحٰبُ النَّارِ :آگ والے
اَنْ : کہ
عَلَيْنَا :ہم پر
اَوْ :یا

وَبَيْنَهُمَا :اور ان دونوں کے درمیان
وَعَلَى الْاَعْرَافِ:اور (اس کی) بلندیوں پر
يَّعْرِفُوْنَ :جو پہچانتے ہیں
بِسِيْمٰهُمْ :ان کی نشانی سے
اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ :جنت والوں کو
سَلٰمٌ :سلامتی ہو
لَمْ يَدْخُلُوْهَا:وہ داخل نہیں ہوئے اس میں
يَطْمَعُوْنَ :آرزو کرتے ہیں
صُرِفَتْ :پھیری جائیں گی
تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ:آگ والوں کی طرف
رَبَّنَا :اے ہمارے رب
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ :ظالم قوم کے ساتھ
اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ :بلندیوں والے
يَّعْرِفُوْنَهُمْ :وہ پہچانتے ہوں گے جن کو
قَالُوْا :وہ کہیں گے
عَنْكُمْ :تمہارے
وَمَا :اور وہ جس پر
اَهٰٓؤُلَآءِ :کیا یہ ہیں
اَقْسَمْتُمْ :تم لوگ قسم کھاتے تھے
اللّٰهُ :اللہ
اُدْخُلُوا :(جنہیں کہا گیا) داخل ہو
لَا خَوْفٌ :کوئی خوف نہیں ہے
وَلَآ اَنْتُمْ :اور نہ ہی تم
وَنَادٰٓى : اور پکاریں گے
اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ :جنت والوں کو
اَفِيْضُوْا :تم لوگ بہاؤ
مِنَ الْمَآءِ :پانی میں سے (کچھ)
مِمَّا :اس میں سے جو

رَزَقَكُمْ : عطا کیا تم کو
قَالُوْٓا : وہ لوگ کہیں گے
اللّٰهَ : اللہ نے
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ : کافروں پر
اتَّخَذُوْا : بنایا
لَهْوًا : تماشا
وَّغَرَّتْهُمُ : اور دھوکہ دیا ان کو
فَالْيَوْمَ : تو آج
كَمَا : جیسے کہ
لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا : اپنے اس دن کی ملاقات کو
كَانُوْا : وہ لوگ
يَجْحَدُوْنَ : جانتے بوجھتے انکار کرتے تھے

اللّٰهُ : اللہ نے
اِنَّ : یقیناً
حَرَّمَهُمَا : حرام کیا دونوں کو
الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
دِيْنَهُمْ : اپنے دین کو
وَّلَعِبًا : اور کھیل
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا : دنیوی زندگی نے
نَنْسٰىهُمْ : ہم بھول جائیں گے ان کو
نَسُوْا : وہ بھولے
وَمَا : اور جو
بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو

نوٹ ۱: مادہ ''ل ق ی'' کی لغت البقرۃ:۱۴ کے تحت دی گئی ہے۔ وہاں لفظ تِلْقَآءٌ نہیں دیا گیا ہے۔ اب نوٹ کرلیں کہ اس کا مادہ ''ل ق ی'' ہی ہے اور وزن تِفْعَالٌ ہے۔ علماء نے بتایا ہے کہ اس وزن پر عربی میں دو ہی الفاظ آتے ہیں' ایک تِبْيَانٌ اور دوسرا تِلْقَاءٌ۔

تِلْقَاءٌ کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ لَقِيَ' يَلْقٰى کے متعدد مصادر میں سے ایک مصدر ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ باب مفاعلہ کا ظرف ہے یعنی ملاقات کی جگہ یا سمت۔ ہم نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے' کیونکہ قرآن مجید میں یہ لفظ تین جگہ آیا ہے اور تینوں جگہ اس کو ظرف مان کر ترجمہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

نوٹ ۲: جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام ''اَعراف'' ہے۔ یہ اَفعال کے وزن پر ''عُرْفٌ'' کی جمع ہے اور عرف ہر چیز کے اوپر والے حصے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے اہلِ اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ اس لیے جہنم سے تو نجات ہوگئی مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے' ان کو مقامِ اعراف پر روک لیا گیا۔ تمام اہل جنت اور اہلِ دوزخ کا فیصلہ ہونے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ بالآخر ان کی مغفرت ہو جائے گی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہوئے اور اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ان کو جنت میں داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلے سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔ (منقول از معارف القرآن بحوالہ ابن کثیرؒ)

آیات ۵۲ تا ۵۸

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا
تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ
لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ
مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا
وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ ۚ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا
وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ
رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ
رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

ط ل ب

طَلَبَ يَطْلُبُ (ن) طَلَبًا : کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے جستجو کرنا۔ (۱) کسی چیز کے پیچھے لگنا' تلاش کرنا۔ (۲) چاہنا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۴۔

طَالِبٌ (اسم الفاعل) : تلاش کرنے والا' چاہنے والا۔ ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ (الحج) ''کمزور ہوا چاہنے والا اور جس کو چاہا گیا۔''

مَطْلُوْبٌ (اسم المفعول) : جس کو تلاش کیا گیا' چاہا گیا۔

ح ث ث

حَثَّ يَحُثُّ (ن) حَثًّا : کسی کو کسی کام پر ابھارنا' اُکسانا۔

حَثِيْثٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) : تیز رو' تیز رفتار (اکسایا ہوا ہونے کی وجہ سے)۔ زیر مطالعہ آیت ۵۴۔

س و ق

سَاقَ يَسُوْقُ (ن) مَسَاقًا : جانور کو پیچھے سے ہانکنا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۷۔

سَوِقَ يَسْوَقُ (س) سَوْقًا : موٹی پنڈلی والا ہونا۔

سَائِقٌ (اسم الفاعل): ہانکنے والا۔ ﴿مَعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾﴾ (قٓ) ''اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ ہوگا۔''

سَاقٌ ج سُوْقٌ : پنڈلی' درخت کا تنا۔ ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴿۲۹﴾﴾ (القیامة) ''اور لپٹی پنڈلی پنڈلی سے۔'' ﴿فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ﴾ (الفتح:۲۹) ''پھر وہ سیدھی ہوئی اپنے تنے پر۔''

سُوْقٌ ج اَسْوَاقٌ : بازار۔ ﴿اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۲۰) ''بے شک وہ لوگ کھانا کھاتے ہیں اور چلتے ہیں بازاروں میں۔''

ن ك د

نَكِدَ يَنْكَدُ (س) نَكَدًا : کنویں کا پانی کم ہونا' گزران کا تنگ ہونا۔

نَكِدٌ (صفت) : سخت مزاج' بے فیض۔ زیر مطالعہ آیت ۵۸۔

ترکیب

(آیت ۵۳) ''تَاْوِيْلَهٗ'' کی ضمیر مفعولی ''بِكِتٰبٍ'' کے لیے ہے اور ''نَسُوْهُ'' کی ضمیر مفعولی بھی کتاب کے لیے ہے۔ ''فَيَشْفَعُوْا'' اور ''فَنَعْمَلَ'' کے فاسببیہ ہیں۔ (آیت ۵۴) ''يُغْشِي'' کا فاعل اس میں ''هُوَ'' کی ضمیر ہے' جو ''اَللّٰهُ'' کے لیے ہے۔ ''يَطْلُبُهٗ'' میں ضمیر فاعلی ''اَلَّيْلَ'' کے لیے اور ضمیر مفعولی ''اَلنَّهَارَ'' کے لیے ہے۔ ''حَثِيْثًا'' حال ہے۔ ''وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ'' یہ سب ''خَلَقَ'' کے مفعول ہیں۔ ''مُسَخَّرَاتٍ'' حال ہے۔ (آیت ۵۶) ''بَعْدَ اِصْلَاحِهَا'' میں ''اِصْلَاحٌ'' مصدر ہے' جو معروف اور مجہول دونوں معنی دیتا ہے۔ ترجمہ میں ہم مجہولی معنی کو ترجیح دیں گے۔ (دیکھیں آل عمران:۱۵۴' نوٹ ۱) ''رَحْمَتَ اللّٰهِ'' کی خبر ''قَرِيْبَةٌ'' کے بجائے ''قَرِيْبٌ'' آئی ہے' کیونکہ فَعِيْلٌ کا وزن اگر بمعنی مفعول ہو تو پھر مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے تائے تانیث کے بغیر ہی استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر' حصہ سوم' پیراگراف:۹/۶۰۔) (آیت ۵۷) ''اَقَلَّتْ'' کا فاعل اس میں ''هِيَ'' کی ضمیر ہے جو ''اَلرِّيْحَ'' کے لیے ہے۔ پہلے ''بِهٖ'' کی ضمیر ''سَحَابًا'' کے لیے ہے جبکہ دوسرے ''بِهٖ'' کی ضمیر ''اَلْمَاءَ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ : اور ہم لائے ان کے پاس	بِكِتٰبٍ : ایک ایسی کتاب
فَصَّلْنٰهُ : ہم نے کھول کھول کر بیان کیا ہے	عَلٰى عِلْمٍ : علم (کی بنیاد) پر
جس کو	
هُدًى : ہدایت دیتے ہوئے	وَّرَحْمَةً : اور رحمت ہوتے ہوئے
لِّقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے جو	يُّؤْمِنُوْنَ : ایمان لاتے ہیں
هَلْ يَنْظُرُوْنَ : وہ لوگ کیا انتظار کرتے ہیں	اِلَّا : سوائے
تَاْوِيْلَهٗ : اس کے انجام کار کے	يَوْمَ : جس دن
يَاْتِيْ : آئے گا	تَاْوِيْلُهٗ : اس کا انجام
يَقُوْلُ : تو کہیں گے	الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو

نَسُوْهُ : بھولے اس کو
قَدْ جَآءَتْ : لائے تھے
بِالْحَقِّ : حق کو
لَّنَا : ہمارے لیے
فَيَشْفَعُوْا : تا کہ وہ شفاعت کریں
اَوْ : یا
فَنَعْمَلَ : نتیجتاً ہم عمل کریں
كُنَّا نَعْمَلُ : ہم کیا کرتے تھے
اَنْفُسَهُمْ : اپنے آپ کو
عَنْهُمْ : ان سے
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ : وہ گھڑتے تھے
رَبَّكُمُ : تم لوگوں کا رب
خَلَقَ : پیدا کیا
وَالْاَرْضَ : اور زمین کو
ثُمَّ : پھر
عَلَى الْعَرْشِ : عرش پر
الَّيْلَ : رات کو
يَطْلُبُهٗ : وہ پیچھے لگتی ہے اس کے
وَّالشَّمْسَ : اور (پیدا کیا) سورج کو
وَالنُّجُوْمَ : اور ستاروں کو
بِاَمْرِهٖ : اپنے حکم سے
لَهُ : اسی کے لیے ہے
وَالْاَمْرُ : اور حکم دینا
اللّٰهُ : اللہ

اُدْعُوْا : تم لوگ پکارو
تَضَرُّعًا : گڑگڑاتے ہوئے
اِنَّهٗ : بے شک وہ

مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے
رُسُلُ رَبِّنَا : ہمارے ربّ کے رسول
فَهَلْ : تو کیا
مِنْ شُفَعَآءَ : کوئی شفاعت کرنے والے ہیں
لَنَا : ہماری
نُرَدُّ : ہم لوٹائے جائیں
غَيْرَ الَّذِىْ : اس کے علاوہ جو
قَدْ خَسِرُوْٓا : انہوں نے گھاٹے میں ڈالا ہے
وَضَلَّ : اور گم ہوا
مَّا : وہ جو
اِنَّ : بے شک
اللّٰهُ الَّذِىْ : وہ اللہ ہے جس نے
السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کو
فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ : چھ دنوں میں
اسْتَوٰى : وہ متمکّن ہوا
يُغْشِى : وہ ڈھانپتا ہے
النَّهَارَ : دن سے
حَثِيْثًا : تیز رفتاری سے
وَالْقَمَرَ : اور چاند کو
مُسَخَّرٰتٍ : مطیع کیے ہوئے
اَلَا : خبردار!
الْخَلْقُ : پیدا کرنا
تَبٰرَكَ : بابرکت ہوا
رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ : جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

رَبَّكُمْ : اپنے رب کو
وَّخُفْيَةً : اور چپکے چپکے
لَا يُحِبُّ : پسند نہیں کرتا

الْمُعْتَدِيْنَ : حد سے بڑھنے والوں کو
فِی الْاَرْضِ : زمین میں

وَادْعُوْهُ : اور پکارو اس کو
وَّطَمَعًا : اور آرزو کرتے ہوئے
رَحْمَتَ اللّٰهِ : اللہ کی رحمت
مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ : بھلائی کرنے والوں سے
یُرْسِلُ : بھیجتا ہے
بُشْرًا : خوشخبری ہوتے ہوئے
حَتّٰٓی : یہاں تک کہ
اَقَلَّتْ : وہ بلند کرتی ہیں
سُقْنٰهُ : تو ہم ہانکتے ہیں اس کو
فَاَنْزَلْنَا : پھر ہم اتارتے ہیں
الْمَآءَ : پانی کو
بِهٖ : اس سے
كَذٰلِكَ : اسی طرح سے
الْمَوْتٰی : مردوں کو
تَذَكَّرُوْنَ : تم لوگ نصیحت حاصل کرو
یَخْرُجُ : نکلتا ہے
بِاِذْنِ رَبِّهٖ : اس کے رب کی اجازت سے
خَبُثَ : نکمی ہوئی
اِلَّا : مگر
كَذٰلِكَ : اس طرح
الْاٰیٰتِ : نشانیوں کو
یَّشْكُرُوْنَ : جو حق مانتے ہیں

وَلَا تُفْسِدُوْا : اور تم لوگ نظم مت بگاڑو
بَعْدَ اِصْلَاحِهَا : اس کی اصلاح کیے جانے کے بعد
خَوْفًا : ڈرتے ہوئے
اِنَّ : بے شک
قَرِیْبٌ : قریب ہے
وَهُوَ الَّذِیْ : اور وہ وہ ہے جو
الرِّیٰحَ : ہواؤں کو
بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ : اپنی رحمت کے آگے
اِذَآ : جب
سَحَابًا ثِقَالًا : بھاری بادل کو
لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ : کسی مردہ بستی کے لیے
بِهٖ : اس سے
فَاَخْرَجْنَا : پھر ہم نکالتے ہیں
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ : تمام پھلوں میں سے
نُخْرِجُ : ہم نکالیں گے
لَعَلَّكُمْ : شاید کہ
وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ : اور پاکیزہ بستی
نَبَاتُهٗ : اس کا سبزہ
وَالَّذِیْ : اور وہ (بستی) جو
لَا یَخْرُجُ : نہیں نکلتا (اس کا سبزہ)
نَكِدًا : بے فیض ہوتے ہوئے
نُصَرِّفُ : ہم بار بار بیان کرتے ہیں
لِقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے

نوٹ ۱: آج کل مساجد میں اماموں کا معمول ہو گیا ہے کہ عربی کے کچھ دعائیہ کلمات انہیں یاد ہوتے ہیں اور ختم نماز پر وہ انہیں پڑھ دیتے ہیں اور لوگ آمین کہہ دیتے ہیں۔ اکثریت کو ان کلمات کا مطلب ہی معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ دعا مانگنے کی جو حقیقت ہے وہ یہاں پائی ہی نہیں جاتی۔ دعا پڑھی نہیں جاتی بلکہ مانگی جاتی ہے۔ دوسری بات

یہ ہے کہ اگر کسی کو کلمات کے معنی معلوم ہوں اور وہ سمجھ کر کہہ رہا ہو' لیکن اس کے لب ولہجہ میں تضرع یعنی عاجزی اور انکساری نہ ہو تو یہ دعا مانگنا نہیں ہے بلکہ مطالبہ پیش کرنا ہے' جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں ہے۔ دعا کی روح تضرع ہے اور خفیہ یا آہستہ آواز سے مانگنا افضل اور قرین قبول ہے۔ کیونکہ بلند آواز سے دعا مانگنے میں تواضع اور انکساری کا باقی رہنا مشکل ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: آیات ۵۷' ۵۸ میں بارش اور اس کی برکتوں کے ذکر سے حیات بعد الممات کا اثبات بھی مقصود ہے اور تمثیل کے پیرائے میں رسالت اور اس کی برکتوں کے ذریعہ سے نیک و بد لوگوں میں امتیاز نمایاں ہونے کا نقشہ دکھانا بھی پیش نظر ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابر رحمت چھا جانے اور بارش کے برسنے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعہ سے مردہ زمین کے جی اٹھنے اور اس کے اندر سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو اس حالت کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت سے مردہ انسانیت کے جاگ اٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے اُبل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جس طرح بارش کی برکتیں صرف زرخیز زمین حاصل کرتی ہے' اسی طرح رسالت کی برکتیں صرف صالح لوگ حاصل کرتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

فی زمانہ مذکورہ تمثیل کا اطلاق مسلمانوں کی اکثریت پر ہوتا ہے' جس میں جہلاء کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں' کیونکہ قرآن اور حدیث کی تعلیم سے یہ لوگ نابلد ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لاعلمی کی حالت میں ان لوگوں میں نیک و بد کی تمیز کس بنیاد پر ہوگی اور ان لوگوں کو جب قرآن و حدیث کی کوئی بات بتائی جاتی ہے تو ان میں سے کون لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور کون لوگ گمراہی پر اڑے رہتے ہیں۔ اس بات کو سمجھ لیں۔ اصول یہ ہے کہ پہلے انسان کو کچھ سکھاتے پڑھاتے ہیں' پھر اس کا امتحان لیتے ہیں۔ اسی لیے انسان کی فطرت میں بہت کچھ ڈال کر اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک نیکی اور بدی کا شعور بھی ہے (الشّمس: ۸)۔ جو لوگ اپنی فطرت کی پکار پر کان دھرتے ہیں اور زندگی میں برائیوں سے اجتناب کی روش اختیار کرتے ہیں' ان کی فطری پاکیزگی زندہ رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی ہدایات آتی ہیں تو یہ لوگ اسے اپنے اندر اس طرح جذب کرتے ہیں جیسے زرخیز زمین بارش کے پانی کو۔ پھر حتی المقدور ان پر عمل کرتے ہیں' جس کے نتیجے میں ان کی زندگی میں بھی اور معاشرے میں بھی بہار آتی ہے اور پھول مہکتے ہیں۔

فطری پاکیزگی کو زندہ رکھنے میں اس بات کو ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے کہ انسان اپنے دل میں کس قسم کے جذبات' امنگوں اور خواہشات کی پرورش کرتا ہے اور اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے کس قسم کی صحبت کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ صحبت خواہ افراد کی ہو' کتب کی ہو یا مشترکہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کبھی ساکت نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کسی برائی کے متعلق نہ سوچیں۔ اگر ہوائی قلعے بنانے ہیں اور خیالی پلاؤ پکانا ہے تو ان کو اپنے تصور میں نیکیاں اور بھلائیاں کرنے کا

ذریعہ بنالیں۔اس طرح آپ کی اُمنگیں اِن شاءاللہ راہِ راست پر آ جائیں گی۔اور سب سے بہتر یہ ہے کہ آپ دل ہی دل میں کوئی ذکر ورد کرتے رہیں یا درود شریف پڑھتے رہیں۔

آیات ۵۹ تا ۶۴

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ
لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ
وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝۶۴

ترکیب

(آیت ۵۹) ''مَا'' نافیہ کا اسم ''غَيْرُهٗ'' ہے۔اسی لیے ''غَيْرُ'' پر رفع آئی ہے۔اس کی خبر محذوف ہے اور ''لَكُمْ'' قائم مقام خبر ہے۔ (آیت ۶۱) ''لَيْسَ'' کا اسم ''ضَلٰلَةٌ'' ہے جو مؤنث غیر حقیقی ہے۔اس لیے ''لَيْسَتْ'' کے بجائے ''لَيْسَ'' بھی جائز ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ (آیت ۶۲) ''اُبَلِّغُ'' کا مفعولِ اوّل ''كُمْ'' ہے اور ''رِسٰلٰتِ'' مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا : بے شک ہم بھیج چکے ہیں
اِلٰى قَوْمِهٖ : ان کی قوم کی طرف
يٰقَوْمِ : اے میری قوم
اللّٰهَ : اللہ کی
لَكُمْ : تمہارے لیے
غَيْرُهٗ : اس کے علاوہ
اَخَافُ : ڈرتا ہوں
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ : ایک عظیم دن کے عذاب سے
الْمَلَاُ : سرداروں نے
اِنَّا : بے شک ہم
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ : ایک کھلی گمراہی میں

نُوْحًا : نوحؑ کو
فَقَالَ : تو انہوں نے کہا
اعْبُدُوا : تم لوگ بندگی کرو
مَا : نہیں ہے
مِّنْ اِلٰهٍ : کوئی بھی الٰہ
اِنِّيْٓ : بے شک میں
عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر
قَالَ : کہا

مِنْ قَوْمِهٖٓ : انؑ کی قوم میں سے
لَنَرٰىكَ : ضرور دیکھتے ہیں آپؐ کو
قَالَ : انہوںؑ نے کہا

يٰقَوْمِ :اے میری قوم
بِیْ :مجھ میں
وَّلٰكِنِّیْ :اور لیکن میں تو
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ :تمام جہانوں کے رب (کی طرف) سے
رِسٰلٰتِ رَبِّیْ :اپنے رب کے پیغامات
لَكُمْ :تمہاری
مِنَ اللّٰهِ :اللہ (کی طرف) سے
لَا تَعْلَمُوْنَ :تم لوگ نہیں جانتے
عَجِبْتُمْ :تمہیں عجیب لگا
جَآءَكُمْ :آئی تمہارے پاس
مِّنْ رَّبِّكُمْ :تمہارے رب (کی طرف) سے
مِّنْكُمْ :تم میں سے
وَلِتَتَّقُوْا :اور تاکہ تم لوگ تقویٰ اختیار کرو
تُرْحَمُوْنَ :تم پر رحم کیا جائے
فَاَنْجَيْنٰهُ :پھر ہم نے نجات دی انؑ کو
مَعَهٗ :انؑ کے ساتھ تھے
وَاَغْرَقْنَا :اور ہم نے غرق کیا
كَذَّبُوْا :جھٹلایا
اِنَّهُمْ :بے شک وہ
قَوْمًا عَمِيْنَ :ایک اندھی قوم

لَيْسَ :نہیں ہے
ضَلٰلَةٌ :کوئی گمراہی
رَسُوْلٌ :ایک رسول ہوں
اُبَلِّغُكُمْ :میں پہنچاتا ہوں تم لوگوں کو
وَاَنْصَحُ :اور خیر خواہی کرتا ہوں
وَاَعْلَمُ :اور میں جانتا ہوں
مَا :اس کو جو
اَوَ :اور کیا
اَنْ :کہ
ذِكْرٌ :ایک یاددہانی
عَلٰى رَجُلٍ :ایک شخص پر
لِيُنْذِرَكُمْ :تاکہ وہ خبردار کرے تم کو
وَلَعَلَّكُمْ :اور شاید کہ
فَكَذَّبُوْهُ :تو انہوں نے جھٹلایا انؑ کو
وَالَّذِيْنَ :اور انہیں جو
فِی الْفُلْكِ :کشتی میں
الَّذِيْنَ :ان کو جنہوں نے
بِاٰيٰتِنَا :ہماری نشانیوں کو
كَانُوْا :تھے

نوٹ۱: مادہ ''ع م ی'' کی لغت البقرۃ:۱۸ میں دی ہوئی ہے' وہاں لفظ عَمِيْنَ رہ گیا تھا۔ یہ دراصل فَعِلٌ کے وزن پر صفت ہے جو قاعدے کے مطابق عَمِیٌ کے بجائے عَمٍ استعمال ہوتی ہے۔اس کی جمع سالم قاعدے کے مطابق عَمِيُوْنَ کے بجائے عَمُوْنَ اور حالت نصب و جر میں عَمِيِيْنَ کے بجائے عَمِيْنَ استعمال ہوتی ہے۔

نوٹ۲: گزشتہ آیات ۵۷'۵۸ میں نبوت و رسالت کے متعلق جو اصولی بات تمثیل کے پیرائے میں بیان کی گئی تھی' اس کو اب مسلسل کئی رکوعوں میں تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے۔ یہ تمام قومیں وہ تھیں جن کو اللہ نے عروج اور اقتدار عطا کیا تھا' لیکن انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کی زمین میں عدل و قسط کو درہم برہم کیا' جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک کی گئیں۔ ''ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو ڈھیل دیتے رہتے

ہیں۔عذاب اس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت‘ قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں اور اس میں بدمست ہو جائیں۔‘‘ (منقول از معارف القرآن‘ بحوالہ ابن کثیر)

نوٹ ۳: یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عذاب اور ابتلا میں فرق ہوتا ہے۔ایک تو یہ شکل ہوتی ہے کہ کسی قوم پر کوئی آفت جیسے زلزلہ‘ طوفان وغیرہ‘ اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ لوگ غفلت سے بیدار ہوں۔اس قسم کی ابتلا میں اچھے برے سب آفت کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر ایک فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے۔اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا ان کے پیرو ہوتے ہیں۔ (تدبّر قرآن)

آیات ۶۵ تا ۷۲

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ
الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ
يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ
نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا
اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ
اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ
الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا
كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع

ء ل ی

اَلِيَ يَأْلِيْ (س) اَلْيًا: دنبہ کی چکی کا بڑھ جانا۔یعنی استحقاق اور توقع کے بغیر کوئی فائدہ پہنچنا۔

اَلْيٌ ج اَلَاءٌ : مہربانی‘ نعمت۔زیر مطالعہ آیت ۶۹۔

و ح د

وَحَدَ يَحِدُ (ض) وَحْدًا: تنہا ہونا‘ اکیلا ہونا۔زیر مطالعہ آیت ۷۰۔

وَاحِدٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت) : تنہا‘ اکیلا۔ ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۶۳) ’’اور تم لوگوں کا الٰہ اکیلا الٰہ ہے۔‘‘

وَحِيْدٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) : تنہا‘ اکیلا۔ ﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿۱۱﴾﴾ (المدثر) ’’آپ چھوڑ دیں مجھ کو اور اس کو جسے میں نے پیدا کیا اکیلا۔‘‘

ترکیب

گزشتہ آیت ۵۹ میں ''لَقَدْ اَرْسَلْنَا'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''هُوْدًا'' حالت نصب میں ہے۔ (آیت ۶۹) ''فِی الْخَلْقِ'' میں ''اَلْخَلْقُ'' مصدر ہے جو معروف و مجہول دونوں معنی دیتا ہے۔ یہاں ہم مجہولی معنی کو ترجیح دیں گے۔ ''بَصْطَةً'' تمیز ہے۔ (آیت ۷۰) ''وَحْدَهٗ'' حال ہے۔ ''رِجْسٌ'' اور ''غَضَبٌ'' ''وَقَعَ'' کے فاعل ہیں۔

ترجمہ:

وَاِلٰی عَادٍ: اور (بے شک ہم بھیج چکے ہیں) قومِ عاد کی طرف	اَخَاهُمْ: ان کے بھائی
هُوْدًا: ہودؑ کو	قَالَ: انہوں نے کہا
یٰقَوْمِ: اے میری قوم	اعْبُدُوا: تم لوگ بندگی کرو
اللّٰهَ: اللہ کی	مَا: نہیں ہے
لَكُمْ: تمہارے لیے	مِّنْ اِلٰهٍ: کوئی بھی الٰہ
غَيْرُهٗ: اس کے علاوہ	اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: تو کیا تم لوگ تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟
قَالَ: کہا	الْمَلَاُ: سرداروں نے
الَّذِيْنَ: جنہوں نے	كَفَرُوْا: انکار کیا
مِنْ قَوْمِهٖٓ: انؑ کی قوم میں سے	اِنَّا: بے شک ہم
لَنَرٰىكَ: ضرور دیکھتے ہیں آپؑ کو	فِیْ سَفَاهَةٍ: بے عقلی میں
وَّاِنَّا: اور بے شک ہم	لَنَظُنُّكَ: ضرور سمجھتے ہیں آپؑ کو
مِنَ الْكٰذِبِيْنَ: جھوٹوں میں سے	قَالَ: انہوںؑ نے کہا
یٰقَوْمِ: اے میری قوم	لَيْسَ: نہیں ہے
بِیْ: مجھ میں	سَفَاهَةٌ: کوئی بے عقلی
وَّلٰكِنِّیْ: اور لیکن میں تو	رَسُوْلٌ: ایک رسول ہوں
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: تمام جہانوں کے رب (کی طرف) سے	اُبَلِّغُكُمْ: میں پہنچاتا ہوں تم لوگوں کو
رِسٰلٰتِ رَبِّیْ: اپنے رب کے پیغامات	وَاَنَا: اور میں
لَكُمْ: تمہارے لیے	نَاصِحٌ اَمِيْنٌ: ایک دیانت دار خیر خواہ ہوں
اَوَ: اور کیا	عَجِبْتُمْ: تمہیں عجیب لگا

اَنْ : کہ
ذِکْرٌ : ایک یاددہانی
عَلٰی رَجُلٍ : ایک شخص پر
لِیُنْذِرَکُمْ : تاکہ وہ خبردار کرے تم کو
اِذْ : جب
خُلَفَآءَ : خلیفہ
وَّزَادَکُمْ : اور زیادہ کیا تمہیں
بَصْۜطَةً : بلحاظ کشادگی کے
اٰلَآءَ اللّٰهِ : اللہ کی مہربانیوں کو
تُفْلِحُوْنَ : فلاح پاؤ
اَجِئْتَنَا : کیا آپؑ آئے ہمارے پاس
اللّٰهَ : اللہ کی
وَنَذَرَ : اور (اس لیے) کہ ہم چھوڑ دیں
کَانَ یَعْبُدُ : بندگی کرتے تھے
فَاْتِنَا : پس تو لے آ
تَعِدُنَا : تو وعدہ کرتا ہے ہم سے
مِنَ الصّٰدِقِیْنَ : سچوں میں سے
قَدْ وَقَعَ : پڑ گئی ہے
مِّنْ رَّبِّکُمْ : تمہارے رب (کی طرف) سے
وَّغَضَبٌ : اور غضب
تُجَادِلُوْنَنِیْ : تم لوگ بحث کرتے ہو مجھ سے
سَمَّیْتُمُوْهَآ : تم نے نام دھرے جن کے
وَاٰبَآؤُکُمْ : اور تمہارے آباء واجداد نے
اللّٰهُ : اللہ نے
مِنْ سُلْطٰنٍ : کوئی بھی سند
اِنِّیْ : بے شک میں (بھی)
مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ : راہ دیکھنے والوں میں سے ہوں

جَآءَکُمْ : آئی تمہارے پاس
مِّنْ رَّبِّکُمْ : تمہارے رب (کی طرف) سے
مِّنْکُمْ : تم میں سے
وَاذْکُرُوْٓا : اور یاد کرو
جَعَلَکُمْ : اس نے بنایا تمہیں
مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ : نوحؑ کی قوم کے بعد سے
فِی الْخَلْقِ : مخلوق میں
فَاذْکُرُوْٓا : پس یاد کرو
لَعَلَّکُمْ : شاید تم لوگ
قَالُوْٓا : ان لوگوں نے کہا
لِنَعْبُدَ : (اس لیے) کہ ہم بندگی کریں
وَحْدَهٗ : اس کے اکیلے ہوتے ہوئے
مَا : اس کو جس کی
اٰبَآؤُنَا : ہمارے آباء واَجداد
بِمَا : اس کو جس کا
اِنْ کُنْتَ : اگر تُو ہے
قَالَ : انہوںؑ نے کہا
عَلَیْکُمْ : تم لوگوں پر
رِجْسٌ : ایک نحوست
اَ : کیا
فِیْٓ اَسْمَآءٍ : کچھ ناموں میں
اَنْتُمْ : تم لوگوں نے
مَّا نَزَّلَ : نہیں اتاری
بِهَا : جس کی
فَانْتَظِرُوْٓا : پس تم لوگ راہ دیکھو
مَعَکُمْ : تمہارے ساتھ
فَاَنْجَیْنٰهُ : پھر ہم نے نجات دی انؑ کو

وَالَّذِیْنَ :اوران لوگوں کو جو	مَعَہٗ :ان کے ساتھ تھے
بِرَحْمَۃٍ :رحمت سے	مِّنَّا :اپنی طرف سے
وَقَطَعْنَا :اورہم نے کاٹ دی	دَابِرَ الَّذِیْنَ :ان لوگوں کی جڑ جنہوں نے
کَذَّبُوْا :جھٹلایا	بِاٰیٰتِنَا :ہماری نشانیوں کو
وَمَا کَانُوْا :اوروہ لوگ نہیں تھے	مُؤْمِنِیْنَ :ایمان لانے والے

نوٹ :حضرت نوح علیہ السلام کی تیسری نسل میں سے ایک شخص کا نام ارم تھا۔اس کے ایک بیٹے کی اولاد میں عاد ہے اور دوسرے بیٹے کی اولاد میں ثمود ہے۔اس طرح قومِ عاد اور قومِ ثمود' ارم کی دو شاخیں ہیں' ایک کو عادِ اولیٰ اور دوسری کو ثمود یا عادِ ثانیہ کہتے ہیں۔جبکہ ارم کا لفظ عاد اور ثمود دونوں کے لیے مشترک ہے۔

عمان سے لے کر حضر موت اور یمن تک قومِ عاد کی بستیاں تھیں۔اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے تھے۔ان کی زمینیں بڑی سرسبز وشاداب تھیں۔رہنے کے لیے بڑے بڑے اور شاندار محلات بناتے تھے۔بڑے قد آور قویٰ الجُثّہ لوگ تھے۔یہاں سے یہ ساری سرزمین میں دور دور تک پھیل گئے اور اپنی قوت کے مظاہرہ میں لوگوں پر ظلم وزیادتی کرنے لگے:﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ﴾(حٰمٓ السجدۃ:۱۵)
''پس عاد جو تھے فخر اور غرور میں مبتلا ہو گئے اور دعویٰ کرنے لگے کہ ہم سے بڑھ کر قوی کون ہے؟ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے زیادہ قوی ہے''۔پھر اللہ کو بھول کر بُت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو توحید اختیار کرنے اور عدل وانصاف قائم کرنے کی تلقین کی لیکن یہ لوگ دولت و طاقت کے نشہ میں بدمست تھے۔انہوں نے بات نہ مانی تو ان پر پہلا عذاب یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہو گئی۔زمینیں خشک ہو گئیں' کھیتیاں اور باغات جل گئے۔یہ لوگ پھر بھی باز نہ آئے تو ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلط ہوا جس کی ہوا میں ہیبت ناک آواز تھی۔باغات اور محلات زمین بوس ہو گئے۔آدمی ہوا میں اڑتے اور پھر سر کے بل آ گرتے تھے۔اس طرح قوم عاد ہلاک کر دی گئی۔

جب قومِ عاد پر عذاب آیا تو حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے ایک کھیت میں پناہ لی۔یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوا سے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہو رہے تھے مگر اس کھیت میں ہوا معتدل ہو کر داخل ہوتی تھی۔اس لیے وہ لوگ وہاں مطمئن بیٹھے رہے اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔قوم کے ہلاک ہو جانے کے بعد مکہ معظّمہ منتقل ہو گئے اور پھر یہیں وفات پائی۔(ابن کثیر اور معارف القرآن سے ماخوذ)

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

اسلامی ریاست کسے کہتے ہیں.....؟

ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب کا مکتوب اور مدیر حکمتِ قرآن کا جواب

محترمی ومکرمی حافظ عاطف وحید صاحب
مدیر ''سہ ماہی حکمت قرآن'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔آپ کی توجہ حکمتِ قرآن بابت اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء کے حرف اول بعنوان ''پاکستان کی قدر کیجیے'' کے ذیل میں پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دینے کے حوالے سے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے موقف کی تائید کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کا وجود ہی اپنی جگہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔اس کی حفاظت کی ہر کوشش جہاد فی سبیل الحُرّیت کے زمرے میں آئے گی اور ہم اس کی تائید کرتے ہیں اور پاکستان کو نقصان پہنچانے کی ہر سعیٔ نامسعود کی نہ صرف یہ کہ مذمت کرتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت میں کسی حد تک جا سکتے ہیں۔بایں ہمہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست قرار دینا محلِّ نظر ہے۔کسی ریاست کے اسلامی ہونے کی جو بنیادیں قرآن نے فراہم کی ہیں وہ سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں بیان ہوئی ہیں۔ان کی روشنی میں کیا ہم پاکستان یا دیگر مسلم ملکوں کو اسلامی کہہ سکتے ہیں؟ مزید برآں سورۃ المائدہ آیات ۴۴' ۴۵' ۴۷ میں اللہ کے نازل کردہ قوانین کو نظر انداز کرنے والی حکومتوں اور ریاستوں کے بارے میں جو فتویٰ (تنبیہہ) قرآن کا ہے' اس کے باوصف کیا پاکستان کو اسلامی کہنا درست ہے؟ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس میں عملی اعتبار سے کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو پھر ہمارا کام صرف ترغیب وتشویق یا زیادہ سے زیادہ انذار وترہیب تک محدود ہونا چاہیے۔ہم اگر مولانا تھانویؒ کے موقف کو تسلیم کر لیں تو پھر انقلابی راستے کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ہم فکر اقبال کے امین ہیں جنہوں نے اس موقف کی شدت سے تردید کی تھی جب متحدہ ہندوستان میں انگریز کی غلامی کے دور میں کچھ علماء نے نماز وروزے کی آزادی کو پورے اسلام کی آزادی سے تعبیر کیا تھا۔ان کی پھبتی ملاحظہ کریں: ''ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت۔ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!''

ہم جب تنظیمِ اسلامی کے پلیٹ فارم سے نظامِ خلافت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد موجودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ہے نہ کہ اس کی تائید کر کے اس کو سندِ جواز مہیا کرنا ہے۔غلبہ واقامتِ دین اور نظام کی تبدیلی کا مطلب ہی یہ ہے کہ پاکستان میں دستوری اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے کے باوجود تا حال اسلامی قوانین کی تنفیذ نہیں ہو سکی ہے' بلکہ حاکمیتِ عوام کے فلسفے کے مطابق اس ملک کو چلایا جا رہا ہے۔ہمارے نزدیک

اس وقت پاکستانی حکومت بالفعل Secularism کی علمبردار ہے۔ ہمارے حکمران اسلام سے بغاوت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ سود جیسی لعنت کو ملک وقوم پر مسلّط کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کیے ہوئے ہیں۔ کل ہی نواز شریف صاحب نے چکوال میں ہندوؤں کے گردوارے کی تزئین وآرائش کروا کر اس کی زیارت کے دوران واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ ''مذہب سب کا اپنا اپنا لیکن انسانیت مشترکہ اثاثہ ہے''۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ ہماری اساس مذہب نہیں بلکہ وطن ہے اور ہم سب پاکستانی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''پاکستان پانچ مذاہب پر مشتمل ایک حسین گل دستے کی مانند ہے۔''

ادھر ہمارا دستور بھی کہنے کی حد تک اسلامی ہے۔ اسی لیے بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے ''منافقت کا پلندہ'' قرار دیتے تھے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ انہوں نے اس ملک کی خیر خواہی کے پیش نظر دستور میں ترمیم کا ایک بل بھی ماہرین قانون کی مشاورت سے تیار کروایا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام اور شریعت کے نفاذ کا عمل ہموار اور تدریجی طور پر آگے بڑھ سکے۔ شومئی قسمت کہ ہمارے حکمرانوں کے مقدر میں شاید یہ سعادت نہیں ہے۔

ہمارا منہج نبی ﷺ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ اس کی موجودگی میں اپنے موقف میں تبدیلی ہمارے لیے کسی طرح مفید نہیں ہوگی۔ ہم دعوت کے مرحلے میں ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ہم اپنی ساری توجہ عوام اور حکمرانوں پر اتمام حجت کرنے پر مرتکز رکھیں تو ان شاء اللہ اگلے مراحل بھی بخیر انجام پائیں گے۔ وقتی مصلحتوں کے پیش نظر اپنے موقف میں لچک کسی طرح مفید نہیں ہوگی۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم قبل از وقت کوئی تصادم کی پالیسی اختیار کریں۔ عالمی حالات کے پیش نظر ہمیں نہایت حکمت اور مؤمنانہ فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے انقلابی منہج کے مطابق آگے بڑھنا ہے۔ تنظیمی جرائد کو بانیٔ تنظیم اسلامی کی فکر کو intact رکھتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر طرح کی آزمائش سے محفوظ رکھے اور فکری انتشار سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ **اللھم ارنا حقیقة الاشیاء کما ھی۔ اللّٰھم ارنا الحق حقّا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ آمین یا ربّ العَالَمین!**

والسلام
اخوکم فی اللہ
ضمیر اختر خان

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جوابِ مدیر

محترمی ومکرمی ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ وبعد۔

سب سے پہلے تو میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ازراہِ لطف وعنایت میری رہنمائی اور اصلاح کی خاطر اور ریکارڈ کی درستگی کے پیشِ نظر بعض نکات تحریر فرمائے ہیں۔ میں اس تکریم پر آپ کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ کو حسبِ نیت وخلوص اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین! حسبِ وعدہ آپ کی یہ تحریر حکمتِ قرآن میں شائع کی جارہی ہے۔

جیسا کہ آپ نے میرے اداریے سے اندازہ لگایا ہوگا کہ میرے پیش نظر اصلاً انتہا پسندانہ سوچ اور تکفیری و خارجی اندازِ فکر کی تردید ہی تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ پاکستان کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے نکتۂ نگاہ سے مولانا تھانویؒ جیسے جامع الصّفات عالمِ معقول ومنقول کے حوالے سے ایسا نکتہ سامنے آیا کہ خیال ہوا کہ شاید دین کے نام پر تاریخ کے اس عظیم فتنہ کے علمی رد کے لیے یہ روشنی کی ایک کرن ہے۔ لیکن چونکہ میرا اندازِ تحریر ناقص وناتجربہ کار ہے اس لیے آپ کو اس کی زد ہمارے تصورِ اقامتِ دین پر پڑتی محسوس ہوئی، جس کا آپ نے بروقت اور برموقع نوٹس لیا۔ اسی لیے مجھے آپ کی حسنِ نیّت وشدّتِ خلوص نے مجبور کیا کہ وضاحت میں چند باتیں تحریر کروں۔

محترم! ہم جس تصورِ دین کے امین ہیں اس کے اہم نکات میری ناقص سمجھ کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) خود اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کے تقاضے ادا کرنا۔

(۲) اسی بندگیٔ رب کی دعوت دینا اور قرآن کی تعلیمات کو عام کرتے ہوئے عوام وخواص کو اس بندگیٔ رب کی جانب متوجّہ کرانا اور جماعت سے وابستہ کرنا۔

(۳) ایمانی اور عددی قوت کی بنیاد پر اور ایک مضبوط جماعت کے ذریعے باطل قوتوں کو شکست دینا اور اس ذریعے سے غیر شرعی قوانین، رسم ورواج وتہذیبی روایات کے خاتمے کی جِدّوجُہد کرنا اور ان کی جگہ اسلام کی عادلانہ تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبہ میں سربلند کرنے کی انقلابی سعی وجُہد کرنا۔ آپ نے غالباً اسے ہی ''موجودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنا'' سے تعبیر کیا ہے۔

(۴) اس تصورِ دین کے مطابق عملی جِدّوجُہد کے دوران جب اور جہاں ضرورت داعی ہو Soft Revolution کی راہ بھی ہموار کرتے رہنا۔ جس میں دستورِ پاکستان کو منافقت سے پاک کرنے، بینکاری نظام سے سود کو خارج کروانے، فحاشی وعریانی کے خلاف قانونی جنگ لڑنے اور آگاہیٔ منکرات کے ضمن میں عوامی مہم چلانے جیسے نمایاں، اہم اور مفید کام بھی شامل ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے اس پورے بیانیے میں ہر دو رستوں (یعنی عریاں انقلاب یا سوفٹ ریوولیوشن) سے

چونکہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامۃ الدین بطورِ مقصدِ اعلیٰ مفروض ہے، جو ہر حال میں مطلوب ہے، چاہے معروضی طور پر یہاں دس فیصد اسلام پر عمل درآمد ہو رہا ہو یا اسّی، نوّے فیصد، لیکن چونکہ اقتدار اور قبضہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے پاکستان کو ایک کافر مملکت قرار دینے کی کہیں ضرورت پیش نہیں آتی.....اور نہ ہی یہاں کے حکمرانوں اور افواج کو مسلمانی شناخت سے محروم کرنے کا تکلف کرنا پڑتا ہے۔ بانیٔ تنظیم نے شاید اسی نقص، عملی کمزوری اور ''منافقت'' کے اعتبار سے ''نظامِ باطل'' کی اصطلاح استعمال کی ہے نا کہ کافر ملک یا دارالحرب کی۔

محترم! تصورِ دین اور منہجِ انقلاب کی ہماری اس مشترکہ میراث پر میرے اداریے سے آپ کو جو دھچکا لگا ہے اس کے اسباب میں کچھ علمی غلط فہمیاں شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ ان غلط فہمیوں کو قلب و ذہن سے نکال دیا جائے۔ چند ایک کی جانب اشارہ ان شاء اللہ مفید رہے گا:

(۱) علامہ اقبال کا مشہور و معروف شعر جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یہ شعر اصلاً ماضی کی ایک controversy پر علامہ کی پھبتی ہے جس کا اپنا سیاق و سباق ہے.... لیکن اس پھبتی کو علامہ ہی کے دیے ہوئے آفاقی پیغام یعنی ''کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے...'' اور اس کی عملی صورت یعنی ''قیام پاکستان'' کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے ہرگز استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ علامہ تو قیام پاکستان کو destiny قرار دے کر اس کے ذریعے اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کے خواب دیکھتے تھے اور ہما شما اسی مملکت کو مسلمانی تشخص سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ یہی تو سیکولر طبقات چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ والدِ محترمؒ بھی علامہ کو ''مبشّرِ پاکستان'' کا خطاب دیتے تھے! آخر کیوں؟؟ اور کیا اُس British India اور موجودہ پاکستان میں نوعیت کا کوئی ایسا فرق نظر نہیں آتا کہ علامہ کی اُس وقت کی پھبتی کو ایک دائمی فلسفہ کی حیثیت دینا اور ہمارے پورے دینی discourse کو اس کی بھینٹ چڑھانا ایک مجبوری بن جائے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہیں چاہتے ہوں گے!

(۲) میری التجا ہے کہ دفاعِ پاکستان کو ''جہاد فی سبیل الحریت'' قرار دے کر صرف رسمی تائید پر اکتفا نہ کی جائے۔ یہ تو شرعی اصطلاح میں ''دفاعی جہاد'' ہے۔ اس کے اصول و ضوابط کتبِ فقہ میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ اور پاکستان کے معاملے میں دفاعی جہاد کی تائید و تصویب (جیسا کہ آپ نے اپنی تحریر میں بھی کی ہے) بغیر اسے بِالقُوّۃ مسلم ملک تسلیم کیے کیسے ممکن ہو سکے گی؟ واضح رہے کہ جہاد فی سبیل الحریت کی اصطلاح صرف ایک خارجی situation کی وضاحت کے لیے استعمال کی جاتی ہے نا کہ بطور ایک شرعی اصطلاح کے!

(۳) یادش بخیر والدِ محترمؒ نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کو احیائے دین کے اہم گوشوں میں شمار کیا ہے (بحوالہ تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ آخری حصہ)۔ تو اب کیا ہمیں احیائے دین کے تاریخی منظرنامے سے اس لیے دستبرداری اختیار کر لینی چاہیے کہ ہمارے حکمرانوں نے نظریہ پاکستان سے بیوفائی برتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ

خارجی حالات کے دباؤ میں ہمیں بانیٔ محترم کے عمرانی فکر کے اس پہلو سے خوامخواہ الرجک ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم دفاع پاکستان کی ملی ذمہ داریوں سے بھی بیزاری محسوس کرنے لگیں۔

(۴) میں نے آپ کی تحریر میں ایک لفظ کی ترمیم کی ہے (اگر آپ کی اجازت ہو تو)۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''مزید برآں سورۃ المائدہ آیات ۴۴، ۴۵، ۴۷ میں اللہ کے نازل کردہ قوانین کو نظرانداز کرنے والی حکومتوں اور ریاستوں کے بارے میں جو ''فتویٰ'' قرآن کا ہے اس کے باوصف کیا پاکستان کو اسلامی کہنا درست ہے؟'' میں نے اس عبارت میں لفظ ''فتویٰ'' کو لفظ تنبیہہ سے بدل دیا ہے۔ اس لیے کہ ''فتویٰ'' ایک اصطلاحی لفظ ہے..... جس کی فنی تعریف یہ کی گئی ہے: ''تبين الحكم الشرعي عن دليل لمن سئل عنه'' (الموسوعة الفقهية)۔ اسی طرح ''مفتی'' کی یہ ایک مقبول عام تعریف ہے: ''المفتي من كان عالما بجميع الاحكام الشرعية بالقوة القريبة من الفعل'' (الموسوعۃ.....)۔ لہٰذا اصطلاحِ شرع میں فتویٰ کسی غیر معصوم عالم کا ہوا کرتا ہے..... نہ کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا۔ قرآن میں جو آیا ہے: ''قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ...'' تو یہ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے نہ کہ اصطلاحی معنی میں۔ جیسے کہ ''يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ...'' میں لفظ وصیۃ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ آپ کی تحریر میں سیاق وسباق سے لفظ فتویٰ سے اصطلاحی مراد نکلتی ہے اس لیے میں نے لفظی ترمیم کی جسارت کی ہے۔

اس جزئی ترمیم کی وضاحت کے بعد..... اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا سلف صالحین کو اور جمہور علمائے امت کو سورۃ الحج اور سورۃ المائدہ کی محولہ بالا آیات کا علم نہ ہو سکا تھا کہ ہمیں قرآنی تنبیہات کی موجودہ حالات پر تطبیق میں ان بحثوں کی جانب دیکھنے کی بالکل ہی ضرورت نہ رہے جو انہوں نے ان آیات اور اس مضمون کی احادیث مبارکہ کو یکبارگی سامنے رکھ کر کی ہیں۔ بادیٔ النظر میں یہ طرزِ عمل منکرینِ سنت کا تو ہو سکتا ہے راسخ العقیدہ اہل علم کا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور فقہائے اسلام ان آیات سے بھی واقف تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ذخیرۂ حدیث، فقہ، اجماع واستدلال کے اصولوں سے بھی ہم سے زیادہ واقف تھے۔ چنانچہ صحت وسلامتیٔ فکر کے لیے ضروری ہے کہ ان آیات کو جمہور اُمت کی تشریحات اور ''اسلامی ریاست'' کے بارے میں واضح کردہ تعریفات کے ساتھ جوڑ کر حکم اخذ کیا جائے۔ اسی لیے میں نے اپنے اداریے میں مکرّر درخواست کی تھی کہ ''یہ بحث گہرے تفکّر وتفقّہ کی محتاج ہے....'' اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''اس واضح موقف سے دلیل کی بنیاد پر علمی اختلاف اہلِ علم کا حق ہے، ایسے اہلِ علم جن کی علمیت ودیانت مسلّم ہے۔''

(۵) آپ کی تحریر میں اس اندیشہ کا اظہار ہوا ہے کہ ''اگر ہم مولانا تھانویؒ کے موقف کو تسلیم کر لیں تو پھر انقلابی راستے کو خیرباد کہنا پڑے گا''۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ اگرچہ میرے پیش نظر مولانا تھانویؒ کے موقف کا ذکر محض انتہا پسندانہ تکفیری فکر کی تغلیط کے طور پر تھا اور میں نے اسے علمی بحث کی حد تک ایک موقف کے بیان کے طور پر ہی ذکر کیا تھا..... اور اس سے علمی اختلاف کو خوش آمدید کہا تھا..... یعنی اُسے من وعن تسلیم کرنے کی دعوت ہرگز نہیں دی تھی اور نہ ہی اسے اپنا موقف قرار دیا تھا۔ تاہم اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تب بھی منطقی طور پر انقلابی طریقِ کار کو خیرباد کہنے کی قطعاً کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پیدا ہونے والی منطقی الجھن کو

دور کر لینا بھی ضروری ہے۔

محترم! بات یہ ہے کہ یہ دو الگ مقدمات ہیں جو باہم غیر مستلزم ہیں۔ آپ نے اسے باہم لازم وملزوم بنا دیا ہے اور ایک مفروضے کو وقوعے کا درجہ دے دیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ نہ حضرت تھانویؒ کی بات کو پورے طور پر سمجھا گیا ہے اور نہ ہی انقلابی راستے کی یہ تعبیر درست ہے۔ چنانچہ ان میں تضاد دکھایا گیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ حضرت تھانویؒ کی بات اشتراکی انقلابی کا مریڈوں کے منہج سے تو متضاد ہو سکتی ہے' لیکن پاکستان جیسے ملک میں حکم واقامتِ دین کی جدوجُہد کرنے والے مجاہدین فی سبیل اللہ سے ہرگز نہیں۔ یہ ایک صریح غلط فہمی ہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے پاکستان کو لازماً کافر ملک قرار دیا جائے۔ اس کی مزید وضاحت آگے بھی آئے گی۔

(۶) اسی طرح آپ کے اس فرمان کہ ہم ''فکرِ اقبال کے امین ہیں'' سے بھی غیر ضروری طور پر مترشح ہو رہا ہے کہ سلف صالحینِ امت جو علم نبوت کے ورثاء ہیں' کی وراثتِ علمی سے تو دستبردار ہوا جا سکتا ہے فکرِ اقبال سے ہرگز نہیں...! (اس بات سے قطع نظر کہ مجھے تو ان دونوں میں واقعی تباعد نظر نہیں آتا۔)

یہ اپروچ اور سوچ ہمیں کہاں تک لے جا سکتی ہے' اس خیال سے میں لرز جاتا ہوں۔ چنانچہ یہاں میں رسول اللہ ﷺ کا قولِ مبارک نقل کرنے میں عافیت پاتا ہوں کہ انَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے!!

(۷) آپ کو محض غلط فہمی کی بنا پر یہ تأثر ملا ہے کہ ادارہ سے موجودہ حکمرانوں کو سندِ جواز دی گئی ہے۔ یہ محض ایک الجھن ہے۔ اس لیے کہ کیا یہ ایک امر واقعہ نہیں ہے کہ بانیٔ محترم بھی تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے حکمرانوں کو اکثر اصلاحی مشورے دیتے رہے ہیں۔ نیز ''مملکتِ خدادادِ پاکستان'' کے استحکام و بقاء کی تجاویز بھی بارہا تنظیمی مہمات کی شکل میں حکمرانوں کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ سب کچھ ہمارے ماضی قریب کا واقعی حصہ ہے تو بانیٔ محترم کی ان مہمات کو آپ کس نظر سے دیکھیں گے؟ ظاہر ہے اس سے سندِ جواز دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا!

مزید برآں آپ ہی کے بقول ''بانیٔ محترم نے ملک کی خیر خواہی کے پیشِ نظر دستور میں ترمیم کا ایک بل بھی ماہرینِ قانون کی مشاورت سے تیار کروایا تھا''۔ حاشَ لِلّٰہ' کیا اس عمل سے بانیٔ محترم نے نظام باطل کو سندِ جواز مہیا کی تھی؟

(۸) آپ کے مراسلے میں متعدد اشارات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیشتر خدشات صرف التباسِ ظاہری کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے ہی الفاظ پر غور کیجئے: ''دستوری اعتبار سے اللہ کی حاکمیت قبول کرنے کے باوجود...''، ''اس وقت پاکستانی حکومت ''بالفعل'' سیکولرازم کی علمبردار ہے''، ''ادھر ہمارا دستور بھی کہنے کی حد تک اسلامی ہے...''، ''بانیٔ تنظیم اسے منافقت کا پلندہ قرار دیتے تھے...'' وغیرہ۔ ان سب qualifiers کو لاگو کرنے سے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ آپ بھی پاکستان کو ''بِالقُوّۃ'' اسلامی ریاست مانتے ہیں... مگر ''بالفعل'' نہیں۔ اگر میرا یہ حسنِ ظن درست ہے تو اب بنائے نزاع کیا رہ گیا؟ مولانا تھانویؒ نے اسی بات کو دوسرے اسلوب سے بیان کیا ہے۔

چنانچہ میں تو یہاں تک بھی کہے دیتا ہوں کہ پاکستان کے کلمہ گو حکمرانوں کو نفاذِ شریعت کی قدرت حاصل ہونے کے نتیجہ میں اسے بالقوۃ اسلامی مملکت قرار دینے کے باوجود' فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف (شرائط پوری ہونے پر) خروج کے امکانات اور شرعی جواز کو بھی ختم نہیں سمجھنا چاہیے' بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اگر حالات متقاضی ہوں اور شرائط پوری ہوتی ہوں تو خروج کو نظری طور پر ممکنہ راستہ متصور کیا جانا چاہیے! مجھے اس بارے میں اس لیے کوئی شبہ نہیں کہ سیدنا حسینؓ کا خروج ہو یا اس کے بعد سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ یا جناب نفس زکیہؒ کا خروج' کہیں اس بات کی ضرورت نہیں پیش آئی کہ قلبِ اسلام کو مرکز کفر قرار دیا گیا ہو۔ بعد والوں نے سابقہ تجربات کی روشنی میں یہ اجتہاد کیا ہے کہ خروج سے صرف فتنہ وفساد نہ ہو بلکہ کامیابی کے روشن امکانات ہوں تو خروج کیا جائے..... بصورتِ دیگر تبدیلی کے دیگر طریقوں کو بروئے کار لایا جائے۔ بحمدِ اللہ تنظیم کا منہج اسی کی عملی شکل ہے۔

(۹) محترم! آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ نہ تو اس اداریے سے کسی موقف میں تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی لچک پیدا ہوتی ہے۔ بعض علمی الجھنوں کو البتہ دور کرنے کی ضرورت ہے جو ہمیں main stream علمیت میں پنپنے نہیں دیتیں۔ نتیجتاً ہر دوسرا علمی مبحث ہمیں اپنے خلاف سازش محسوس ہوتا ہے' اور حد تو یہ ہے کہ مولانا تھانویؒ جیسی شخصیت کی باتوں سے بھی ہم لرزنے لگتے ہیں۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تصورِ دین بھی واضح ہے اور طریق کار بھی۔ اور مجھے پورا اعتماد ہے کہ ہمارا دینی تراثِ علمی ہمارے تصورِ دین اور طریق کار..... دونوں کی تائید میں ہمارے پیچھے کھڑا ہے۔ جبکہ ہم اپنی لاعلمی میں اُسے اپنا مخالف تصور کر بیٹھے ہیں۔ لہٰذا اداریے میں پیش کردہ معروضات کو موقف کی کوئی تبدیلی یا نرمی و لچک سمجھنا کسی غلط فہمی یا پروپیگنڈے کے زیر اثر تو ہو سکتا ہے' حقیقت میں نہیں! آپ کو معلوم ہے کہ propaganda techniques کیسے لطیف انداز سے کام کرتی ہیں۔ اور مجھے اندازہ ہے کہ ہماری علمی روایت کے خلاف کیا کیا پروپیگنڈے کیے جا رہے ہیں۔ جان لیجئے کہ یہ سب لاعلمی اور جہالت کے سبب سے ہے۔ مجھے اس کا دکھ تو ہے' البتہ ایسی فکرمندی نہیں ہے' اس لیے کہ ہماری علمی روایت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے' اور آپ کو بھی اُن سے متاثر ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اللہ ہمارا محافظ و نگہبان ہے!!

آخر میں عرض گزار ہوں کہ 'حکمت قرآن' اپنی شناخت کے اعتبار سے ایک علمی جریدہ ہے' جسے کسی قدر وسعتِ خیال و بیان کا برتاؤ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہو تو بحث و مکالمہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ سوچوں پر پہرے لگا دینے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ چنانچہ دلیل کی بنیاد پر کی گئی اختلافی بات اور پیرائے کو بھی بسا اوقات بیان کرنا پڑتا ہے تاکہ علمی ماحول برقرار رہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا مطلب پا گئے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق بات قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور کسی کی مخالفت ہمیں جادۂ عدل سے منحرف نہ کرے۔ آمین!

والسلام مع الاکرام

حافظ عاطف وحید

کامیاب اُستاذ کی صفات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزّاق اسکندر ☆

تعلیم وتدریس ایک معزز اور قابل احترام منصب ہے‘ جس کے لیے کچھ شرائط اور آداب ہیں‘ جن کا جاننا اور ان کی عملی مشق کرنا ایسا ہی ضروری ہے‘ جیسے کسی فن کو سیکھنے کے لیے اس کی عملی مشق ضروری ہوتی ہے۔ فنِ تدریس کے لیے ذوق‘ فطری صلاحیت اور اس منصب کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے توجہ‘ محنت اور مشقت کی ضرورت ہے‘ تاکہ اسے سیکھنے والا ایک معلّم کامل بن کر نکلے اور اس میں ایک کامیاب استاذ کی صفات اور خصائص موجود ہوں‘ جس سے اس کے تجربہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے۔ نیز جب وہ تدریس کے میدان میں قدم رکھے تو طلبہ اس سے مستفید ہوں اور وہ خود بھی علمی اور روحانی لذت محسوس کر سکے۔

تعلیم وتدریس ایک مقدس منصب ہے جو سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت اور فرائض نبوت میں سے ایک فریضہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾﴾ (آل عمران)

’’اللہ نے احسان فرمایا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں سے‘ پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی باتیں۔ اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔‘‘

نبی کریم ﷺ کا اِرشاد ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِيْ مُعَنِّتاً وَلَا مُتَعَنِّتاً، وَلٰكِنْ بَعَثَنِيْ مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا)) (۱)

’’اللہ نے مجھے مشکلات میں ڈالنے والا اور سختی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا‘ بلکہ مجھے معلم اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

نبی مکرم ﷺ کو اللہ نے معلم بنا کر بھیجا‘ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا))(۲)

’’مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔‘‘

آپ ﷺ پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس میں علم اور تعلیم ہی کا ذکر تھا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِيْ

☆ شیخ الحدیث ومہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن‘ کراچی

﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵﴾ (العلق)

''(اے پیغمبر ﷺ!) آپ اپنے اس رب کا نام لے کر (قرآن) پڑھیے جس نے پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ آپؐ (قرآن) پڑھیے اور آپؐ کا رب بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی' اس نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔''

آپ ﷺ میں وہ تمام صفاتِ عالیہ موجود تھیں جو ایک معلم کامل میں مطلوب ہیں' آپ کمالِ علم' خلقِ عظیم' اُسوۂ حسنہ اور کمالِ شفقت اور رحمت جیسی صفات کے ساتھ موصوف تھے۔

اسی بنا پر جو عالمِ دین' قرآنِ کریم یا کسی شرعی علم کی تدریس کا کام سرانجام دے رہا ہے' وہ اِس صفت میں نبی کریم ﷺ کی نیابت کر رہا ہے' لہٰذا اسے یہ جاننا چاہیے کہ وہ ایک سعادت مند انسان ہے اور اسے یہ سعادت مندی مبارک ہو۔ ان شرعی علوم میں سے ایک علم عربی لغت بھی ہے جو قرآنِ کریم کی زبان' نبی کریم ﷺ کی زبان اور شریعت اِسلامیہ کی زبان ہے۔ چوں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے استاذ کے اثرات شاگردوں پر پڑتے ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اُمت کے لیے معلّم اور مربّی بنا کر بھیجا اور آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی' جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾ (النساء:۱۱۳)

''اور آپؐ کو وہ کچھ سکھایا جو آپؐ نہیں جانتے تھے۔''

مزید فرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴﴾ (القلم)

''اور بے شک آپؐ تو اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔''

اس لیے آپ ﷺ ایک اعلیٰ اور کامل معلم تھے' ایسا باکمال معلّم نہ آپ سے پہلے کسی نے دیکھا اور نہ آپ کے بعد کسی نے دیکھا۔ آپ ﷺ کی اعلیٰ صفات میں کمالِ علم' عظیم حکمت' اعلیٰ اخلاق' شاگردوں کے ساتھ شفقت و رحمت' ان کی تعلیم و تربیت کے لیے نہایت عمدہ اور مفید اسالیب کا استعمال اور ان کی خبر گیری جیسی صفات اپنے کمال کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ اس لیے جو معلم اور استاذ آپ ﷺ کا نائب بننا چاہے اور فنِ تدریس میں کمال تک پہنچنے کا خواہش مند ہو تو اُسے چاہیے کہ پہلے نبی کریم ﷺ کی صفات و کمالات جو اِس میدان سے متعلق ہیں' معلوم کرے اور پھر اِن صفات میں آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''(مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں ایک عمدہ نمونہ ہے۔''

اب میں اختصار کے ساتھ چند ایسی صفات کا ذکر کروں گا جو ایک کامیاب استاذ اور مدرّس کے لیے ضروری ہیں اور ضمناً ان کی مثالوں کی طرف اشارہ کرتا جاؤں گا' کیونکہ میرے سامنے اِس وقت دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے فضلاء ہیں اور یہ مثالیں اُن کے ذہنوں میں ابھی تر و تازہ ہیں' اس لیے کہ وہ حال ہی میں احادیث پڑھ کر فارغ ہوئے ہیں۔ وہ صفات درج ذیل ہیں:

(۱) علم میں کمال

معلّمِ کامل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن میں پوری مہارت رکھتا ہو' آپ ﷺ کے بارے میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾﴾ (النساء)

''اور سکھائیں آپ کو وہ باتیں جو آپ نہ جانتے تھے' اور اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔''

کامیاب اُستاذ کی صفت یہ ہے کہ وہ امکانی حد تک علم میں کمال رکھتا ہو' خصوصاً اُس مضمون اور فن میں جس کے پڑھانے کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے' کیوں کہ استاذ کو جس مضمون میں جتنی مہارت اور دسترس ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ طلبہ کو فائدہ پہنچا سکے گا۔ لہٰذا متعلقہ مضمون میں کمال حاصل کرنے کے لیے استاذ کو چاہیے کہ وہ:

(۱) اس مضمون کی بنیادی کتابیں ہمیشہ اپنے زیرِ مطالعہ رکھے۔
(۲) جو کتاب اُسے پڑھانی ہے' اسے بار بار دیکھے۔
(۳) دورانِ مطالعہ اگر کسی عبارت یا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں دِقت پیش آئے تو اپنے استاذ سے مراجعت کرے۔
(۴) اگر اپنا استاذ نہ ہو تو اُس مضمون کے کسی ماہر استاذ سے رجوع کرے' اس سے پوچھے' اس کے ساتھ مذاکرہ کرے اور اس میں شرم محسوس نہ کرے' کیوں کہ علم حاصل کرنے میں شرم نہیں۔

(۲) فصاحت و بلاغت

کامیاب معلم کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ فصیح اللّسان ہو اور جو مضمون پڑھائے طلبہ کو ذہن نشین کرا دے۔ آپ ﷺ بلا شک افصح العرب تھے اور جامع کلمات کے مالک تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''مجھے **جوامع الکلم** کی صفت عطا کی گئی ہے'' یعنی آپ ﷺ کے الفاظِ مبارک کم اور ان کے معانی زیادہ ہوتے تھے۔ نیز آپ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے' لہٰذا جو بھی اسے سنتا اسے سمجھ لیتا اور بہ وقت ضرورت ایک بات کو تین بار دہراتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی ایک ایک بات آج اُمت کے پاس محفوظ ہے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ کی بحیثیت معلمِ کامل کی صفات بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ کے اندازِ گفتگو کے بارے میں فرماتی ہیں:

كان رسول الله ﷺ لا يسرد الكلام كسردكم' ولكن اذا تكلم تكلم بكلام فصل، يحفظه من سمعه (۳)

''رسول اللہ ﷺ تمہاری طرح جلدی جلدی گفتگو نہیں فرماتے تھے' بلکہ آپؐ جب گفتگو فرماتے تو ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے' جو بھی اسے سنتا وہ اسے یاد کر لیتا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی گفتگو کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

((اَنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا' حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ)) (۴)

''نبی کریم ﷺ جب گفتگو فرماتے تو (بہ وقت ضرورت) اسے تین بار دُھراتے' تاکہ سننے والے اسے اچھی

طرح سمجھ جائیں۔‘‘

(۱) لہٰذا ایک کامیاب استاذ کے لیے فصیح و بلیغ ہونا ضروری ہے۔ جس زبان میں وہ طلبہ کو پڑھا رہا ہے‘ اس زبان پر اسے دسترس ہونی چاہیے‘ تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر اور کتاب کے مضمون کو فصیح و بلیغ انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کر سکے‘ جس سے ایک معمولی صلاحیت رکھنے والا طالب علم بھی اسے سمجھ سکے۔

(۲) دورانِ تدریس وہ زبان اِستعمال کرے جو سامنے بیٹھنے والے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہو‘ نہ ان کی سطح سے اتنی اونچی ہو کہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہو اور نہ اتنی نیچی کہ استاذ عوامی سطح پر اتر آئے۔

(۳) گفتگو میں ایک ربط اور ترتیب ہو‘ ٹھہر ٹھہر کر بولے‘ جلدی نہ کرے‘ تاکہ سننے والا اُستاذ کے ہر ہر جملہ کو سنے اور سمجھ جائے۔

(۴) اگر مضمون ایسا ہو جس میں جملوں کو دُھرانے اور بار بار کہنے کی ضرورت ہے‘ تو انہیں بار بار دُھرائے‘ خصوصاً جب عربی زبان کا مضمون ہو۔

(۳) اسالیب اور اندازِ تعلیم

نبی اکرم ﷺ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپؐ تعلیم میں مختلف طریقے اور اسلوب استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ سامعین کا خیال فرماتے‘ ان کے عقلی معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور مختلف علمی مضامین کے اعتبار سے اسلوب بدلتے رہتے۔

غرضیکہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم میں وہ تمام اسالیب اختیار فرمائے جو مفید سے مفید تر ہو سکتے ہیں اور آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کوئی علمی ادارہ اس سے بہتر نیا اسلوب پیش نہیں کر سکا۔

لہٰذا کامیاب استاذ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ تدریس کے مختلف اسالیب اور انداز سے واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس فن کو کس طرح پڑھایا جاتا ہے‘ خصوصاً اس فن کو جسے وہ پڑھا رہا ہے‘ اور یہ بھی جانتا ہو کہ مضمون بدلنے یا طلبہ کی ذہنی سطح اور اِستعداد کے مختلف ہونے سے اسلوب کس طرح بدلا جاتا ہے۔ یہ مستقل موضوع ہے جس پر ایک مستقل رسالہ لکھا جا سکتا ہے‘ یہاں اختصار کے ساتھ چند اسالیب کا ذکر کیا جاتا ہے:

(ا) نصوص اور عبارات کا یاد کرانا: بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کی نصوص اور عبارات کا یاد کرنا اور ان کے الفاظ کی حفاظت کرنا ضروری ہوتا ہے‘ جیسے قرآنِ کریم کی آیات اور ماثور دعائیں۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کی تعلیم کا انداز یہ تھا کہ آپؐ منبر پر بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآنِ کریم یا ماثور دعاؤں کا ایک ایک جملہ پڑھ کر سناتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے سن کر دُہراتے اور اُسے یاد کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُ النَّاسَ التَّشَهُّدَ عَلَى الْمِنْبَرِ كَمَا يُعَلِّمُ الْمُكَتِّبُ الصِّبْيَانَ (۵)

’’رسول اللہ ﷺ منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو تشہد اس طرح سکھاتے تھے‘ جیسے استاذ مکتب والے بچوں کو سبق یاد کراتا ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا الْاِسْتَخَارَةَ فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ (٦)

''رسول اللہ ﷺ ہمیں دعائے اِستخارہ اس طرح سکھاتے تھے جس طرح آپ ہمیں قرآن کی سورۃ سکھاتے تھے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُعَلِّمُهُمْ هٰذَا الدُّعَاءَ كَمَا يُعَلِّمُهُمُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ، يَقُوْلُ: قُوْلُوْا: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ، وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ)) (٧)

''رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام علیہم الرضوان کو یہ دعا اس طرح سکھاتے تھے جس طرح ان کو قرآن کریم کی سورۃ سکھاتے تھے۔ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرماتے: کہو: ''اے اللہ! میں جہنم کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں' میں قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں' مسیح دجال کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں' زندگی اور موت کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔''

تعلیمی میدان میں جن مضامین کی عبارات اور نصوص کا یاد کرنا ضروری ہوتا ہے' اس کے لیے یہی اسلوب زیادہ مناسب اور مفید ہے' جیسے آج بھی اسکولوں میں پہاڑے اور گنتی یاد کرائی جاتی ہے۔

(ب) تعلیم بذریعہ سوال و جواب: تعلیم کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ استاذ ایک طالب علم کو سب طلبہ کے سامنے کھڑا کرے اور اس سے سوال کرے اور وہ طالب علم سب طلبہ کے سامنے اس کا جواب دے' یا استاذ دو طالب علموں کو کھڑا کرے جن میں سے ایک دوسرے سے سوال کرے اور دوسرا اسے جواب دے۔ اس اندازِ تعلیم میں طلبہ کو تعلیم پر توجہ زیادہ رہتی ہے اور اس سے ان کے دلوں میں تعلیم کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں طلبہ اپنی آنکھ' کان اور فکر کے ساتھ متکلم کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں' جس سے وہ علمی مضمون دل میں اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ دین کے کسی اہم مسئلہ کی تعلیم کے وقت عموماً یہ انداز اختیار فرماتے تھے' جیسے عقائد اور مغیبات وغیرہ کی تعلیم کے وقت۔ جس کی مثال جبریل علیہ السلام کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں ایمان' اسلام' احسان اور علاماتِ قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ روایت میں ہے کہ ایک نوجوان' ایک طالب علم کی صورت میں نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوا' صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے تھے' وہ نوجوان باادب حضور ﷺ کے متصل سامنے بیٹھ گیا' اس نے آپ ﷺ سے دین کے بارے میں چند سوالات کیے' آپ ﷺ نے ان کے جوابات دیے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم یہ سارا منظر دیکھ اور سن رہے تھے اور اس سے مستفید ہو رہے تھے' اس کے سوالات یہ تھے:

سوال: آپ مجھے بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟

جواب: آپ ﷺ نے اِرشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور تو نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے' اگر تو وہاں جانے کی استطاعت رکھتا ہے۔

سوال: آپ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیں کہ ایمان کیا ہے؟

جواب: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر' قیامت کے دن پر اور تم ایمان لاؤ اچھی اور بُری تقدیر پر۔

سوال: آپ مجھے احسان کے بارے میں بتائیں کہ احسان کیا ہے؟

جواب: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح بجالاؤ کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو' اگر تم اسے دیکھ نہیں سکتے تو یہ خیال کرلو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

سوال: قیامت کب آئے گی؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: جس سے تم پوچھ رہے ہو' وہ سائل سے زیادہ اس بارے میں نہیں جانتا۔

سوال: آپ مجھے قیامت کی علامات بتائیں!

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کی علامات میں سے یہ ہے کہ باندی اپنی مالکہ کو جنے گی' اور تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے جو ننگے پاؤں' ننگے بدن' غریب اور بکریاں چرانے والے ہوں گے کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لمبی لمبی عمارتیں بنانے لگیں گے۔

یہ آنے والا طالب علم آپ سے سوال و جواب کے بعد مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا تو آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: جانتے ہو' یہ کون ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبریل (علیہ السلام) ہیں' وہ اِس لیے آئے تھے تاکہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔'' نبی کریم ﷺ کے اس فرمان میں غور کریں:

((اِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ))(۸)

کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے صحابہ کو دین سکھانے کے لیے ''سوال و جواب'' کا انداز اختیار کیا! جس سے معلوم ہوا کہ سیکھنے سکھانے کا یہ اسلوب اور انداز بہت ہی قابلِ عمل اور مفید ہے۔

(ج) تعلیم بذریعہ عمل: اسلام کی زیادہ تر تعلیمات عمل سے تعلق رکھتی ہیں' اس لیے نبی کریم ﷺ ان تعلیمات کو عملاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرماتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کو عمل کرتے ہوئے دیکھ کر آپؐ کی اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ جب نماز فرض ہوئی اور اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم نازل ہوا تو آپ ﷺ نے عملاً صحابہؓ کے سامنے نماز ادا کی اور فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))(۹) ''تم اِسی طرح نماز ادا کرو' جس طرح تم مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اسی طرح جب حج کی فرضیت اس آیت مبارکہ:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ﴾ (آل عمران: ۹۷)

''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا' جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔''

کے ذریعے نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اونٹنی پر بیٹھ کر مناسک حج ادا کیے' تاکہ ہر شخص آپ ﷺ کو دیکھ کر ویسا ہی عمل کرے جیسے آپ عمل فرما رہے ہیں' اور پھر آپؐ نے اعلان فرمایا: ((خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ))(۱۰) یعنی اپنی عبادت کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔ احادیث میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں اور عملی احکام کو سکھانے کے

لیے یہی کامیاب طریقہ ہے اور جدید علمی اداروں میں عملی مضامین میں یہی اسلوب اِختیار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام اور علماء اُصول کے ہاں تواترِ عملی ایک اہم شرعی دلیل شمار کی جاتی ہے۔

(د) تعلیم بواسطہ قول وعمل: اس کی صورت یہ ہے کہ متعلقہ مضمون کی عبارت اور نصوص کے معانی اور مطالب کو پہلے اس طرح بیان کر دیا جائے کہ سب طلبہ اس کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔ اگر اُس کا تعلق عمل سے بھی ہو تو پھر استاذ ان کے سامنے اسے عملاً پیش کرے۔ اس اندازِ تعلیم سے طلبہ کے لیے علم اور عمل دونوں کا سیکھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

> ''ہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک بعد والی دس آیات نہ سیکھتے جب تک ان دس آیات پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتے۔'' (۱۱)

(ر) تعلیم بذریعہ اقرار وارشاد: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی مسلمان کو کوئی کام کرتا دیکھتے' اگر وہ صحیح ہوتا تو اسے برقرار رکھتے اور اگر صحیح نہ ہوتا تو صحیح بات کی طرف اس کی راہنمائی فرماتے' جیسے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سفر کی حالت میں سخت سرد رات میں گرم پانی نہ ملنے کی وجہ سے غسل جنابت کے بجائے تیمّم کر لیا اور نماز پڑھی اور آپؐ نے ان کو اس پر برقرار رکھا۔

(س) تعلیم بذریعہ مشورہ اور مناقشہ علمی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت اس طرح بھی فرماتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی درپیش مسئلہ میں جس میں ابھی تک کوئی حکم بذریعہ وحی نازل نہ ہوتا' صحابہؓ کے سامنے حل کے لیے پیش فرماتے' قرآنِ کریم نے بھی آپؐ کو اس کا حکم دیا تھا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) ''آپ ان سے مشورہ کرتے رہیے۔'' اس معاملہ میں صحابۂ کرامؓ اپنی اپنی رائے کا اظہار فرماتے اور آخر میں جو صحیح رائے ہوتی آپؐ اس کی تائید فرماتے یا صحیح رائے کی طرف راہنمائی فرماتے۔ اس طرح آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو عملی تربیت اس بات کی دے دی کہ آئندہ اُمت کو درپیش مسائل کا حل اس طرح نکالیں۔ اسی کو قرآنِ کریم نے ایک اصول اور قاعدہ کے طور پر یوں بیان فرما دیا ہے: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۖ﴾ (الشوریٰ:۳۸) ''اور ان کے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہیں''۔ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد مسلمانوں کو ایک مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ نماز کے وقت مسلمانوں کو مسجد میں کس طرح بلایا جائے' آپؐ نے صحابہؓ کی مجلس میں یہ معاملہ پیش فرمایا' غور وفکر شروع ہوا' کسی نے گھنٹی بجانے کا مشورہ دیا' بعض نے ناقوس بجانے کا اور بعض نے آگ وغیرہ جلانے کا' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ان آراء کو مسترد کر دیا کہ یہ غیر مسلموں کے شعار ہیں۔ آخر میں جب حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ نے خواب میں موجودہ اذان سنی تو آپؐ نے اسے برقرار رکھا اور فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور حق ہے۔

(۴) تعلیم میں نقشہ اور تختۂ سیاہ کا اِستعمال

بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کو سمجھانے کے لیے تختۂ سیاہ اور نقشہ کی ضرورت پڑتی ہے' جس کے ذریعے بعض حقائق کا طلبہ کو سکھانا آسان ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض معنوی حقائق کو سمجھانے کے لیے یہ

انداز بھی اختیار فرمایا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے ایک مربع خط کھینچا۔ پھر اس مربع خط کے درمیان میں ایک خط کھینچا' پھر اس درمیانے خط کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے خط کھینچے اور ایک خط مربع خط کے باہر کھینچا۔ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے فرمایا: جانتے ہو یہ کیا ہے؟ سب نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ درمیانہ خط انسان کی مثال ہے اور اس کے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے خطوط وہ عوارض ہیں جو اُسے زندگی میں پیش آتے ہیں' اگر ایک سے چھوٹ گیا تو دوسرا پکڑ لیتا ہے اور یہ جو مربع خط ہے یہ اس کی اجل ہے اور اس کے ساتھ جو خط باہر جا رہا ہے' وہ اس کی اُمیدیں اور آرزوئیں ہیں۔ (۱۲)

(۵) تعلیم بذریعہ ضرب المثل

کسی معنوی اور غیر محسوس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اُستاذ طلبہ کے سامنے اس کی ایک حسی مثال پیش کرے اور پھر اس معنوی حقیقت کو اس پر قیاس کر کے طلبہ کے اذہان کے قریب کر دے۔ کتب حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ یہاں اُن میں سے ایک مثال ذکر کی جاتی ہے' جس میں نبی کریم ﷺ نے اچھے اور بُرے ہم نشین اور ساتھی کے اثرات کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالْجَلِيسِ السَّوْءِ كَمَثَلِ صَاحِبِ الْمِسْكِ وَكِيْرِ الْحَدَّادِ لَا يَعْدَمُكَ مِنْ صَاحِبِ الْمِسْكِ اِمَّا تَشْتَرِيهِ اَوْ تَجِدُ رِيحَهُ وَكِيرُ الْحَدَّادِ يُحْرِقُ بَدَنَكَ اَوْ ثَوْبَكَ اَوْ تَجِدُ مِنْهُ رِيحًا خَبِيثَةً))(۱۳)

''اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے' جیسے مُشک بیچنے والا اور بھٹیارہ۔ پس مشک بیچنے والا یا تو تمہیں مشک پیش کرے گا یا تم خود اس سے مُشک خرید لو گے' یا (کم از کم) اس کے پاس سے خوش بو آتی رہے گی۔ اور بھٹیارہ یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا' یا (کم از کم) اس سے بدبو تمہیں پہنچے گی۔''

(۶) سوال کے ذریعے اَذہان کو مشغول کرنا

تعلیم کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ استاذ پڑھاتے وقت طلبہ کے سامنے ایک یا ایک سے زائد سوال پیش کر کے سب کے اذہان کو مشغول کر دے' تاکہ وہ جواب سوچیں' پھر ان سے جواب سنے۔ اگر جواب صحیح ہے تو ان کی تصویب کرے' ورنہ صحیح جواب کی طرف ان کی راہنمائی کرے۔ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم میں یہ اسلوب بھی اختیار فرماتے تھے' خصوصاً جب کسی کا امتحان لینا مقصود ہو۔ نیز اس انداز سے طلبہ میں سوچنے اور حقائق میں غور و فکر کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجنا چاہا تو آپ ﷺ نے اُن سے سوال کیا کہ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تفصیلی جواب دیا۔ آپ ﷺ نے ان کا جواب سن کر ان کی تصویب فرمائی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

تعلیم و تدریس کے ان اسالیب کے علاوہ اور بھی مختلف انداز ہیں جن کا تعلق تعلیم کے اعلیٰ مراحل سے ہے'

اس لیے اُن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا' لہٰذا عربی کے اساتذۂ کرام کو چاہیے کہ مذکورہ بالا اسالیب میں سے جو اسلوب بھی مناسب سمجھیں اسے موقع ومحل اور مخاطب کے اعتبار سے استعمال میں لائیں۔

(۷) درس کی تیاری

عربی پڑھانے والے اساتذۂ کرام اگر چاہتے ہیں کہ وہ کامیاب مدرس بنیں اور طلبہ ان سے خوب فائدہ اٹھائیں' تو انہیں چاہیے کہ ہر سبق پڑھانے سے پہلے اسے خوب دیکھیں اور اچھی طرح اس کا مطالعہ کریں' اگر کسی عبارت یا لفظ میں طباعت کی غلطی دیکھیں تو اسے درست کر دیں اور پڑھاتے وقت طلبہ سے بھی وہ غلطی درست کرالیں۔ نیز سبق پڑھانے سے پہلے سبق کا مکمل نقشہ ذہن میں بنالیں کہ آپ اسے کس طرح طلبہ کو پڑھائیں گے۔

تنبیہ: یاد رہے کہ کتابوں میں کبھی کاتب کی غلطی سے (جو عموماً غیر علماء ہوتے ہیں) یا حروف جوڑتے وقت یا ٹائپ کرتے وقت بعض آیاتِ کریمہ' اسی طرح احادیث شریفہ یا کسی عبارت میں طباعت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں' لہٰذا ایسی اغلاط کو بجائے اس کے کہ مصنف کی طرف منسوب کر کے اسے تحریف کا مرتکب قرار دیا جائے' جو کہ ایک مؤمن کی دیانت کے خلاف ہے' بلکہ اُسے دُرست کر لینا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ عالم ثقہ' با اعتماد اور اہلِ علم میں مسلّمہ شخصیت بھی ہو۔

ترغیب: طلبہ کے دلوں میں ترغیب کے ذریعہ علم اور اُس مضمون کا شوق پیدا کرنا ایک کامیاب استاذ کی صفات میں سے ہے' تاکہ طلبہ کے ذہنوں میں اس علم اور مضمون کی اہمیت پیدا ہو' اور وہ اس علم کو شوق ورغبت سے حاصل کریں۔ اس کے لیے استاذ کو کتبِ حدیث میں ''**کتاب العلم**'' کا مطالعہ کر کے اس میں سے چند مطلوبہ احادیث کا اِنتخاب کرنا چاہیے۔

(۸) طلبہ کے ساتھ شفقت ورحمت

ایک معلم کے لیے ضرور ہی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ نہایت مشفق اور ہمدرد ہو۔ حضور ﷺ میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ آپ معلم ہونے کے ساتھ ایک والد کی طرح مشفق اور مہربان بھی تھے' آپؐ کی زبان نہایت پاکیزہ تھی' آپؐ نے کبھی گالی گلوچ سے کام نہیں لیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''میں نے آپ سے بہتر نہ آپ سے پہلے کوئی معلم دیکھا نہ آپ کے بعد' خدا کی قسم نہ آپ نے مجھے ڈانٹا' نہ مجھے مارا اور نہ مجھے برا بھلا کہا۔''

ایک کامیاب معلم کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت بلند اخلاق کا مالک ہو۔ نیز ایک معلم کا کمال یہ ہے تعلیم کے ساتھ شاگردوں کی صحیح تربیت بھی کرے اور خود اپنی ذات کو بطورِ عملی نمونہ پیش کرے' آپ ﷺ کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

''آپ ﷺ ان کی تربیت اور تزکیہ فرماتے ہیں۔''

اور قرآن نے آپ ﷺ کی زندگی کو پوری امت کے لیے بطورِ اُسوۂ حسنہ پیش کیا۔

لہٰذا اُستاذ کو طلبہ پر نہایت شفیق اور ان کے ساتھ نرمی اور رحم کا سلوک کرنا چاہیے۔ اُستاذ طلبہ کو اپنی اولاد کی

طرح عزیز سمجھے اوران کی تعلیم پر خصوصی توجہ دے۔ان کی تربیت‘علم‘اخلاق اوراَچھی عادات اپنانے میں ان پراس طرح محنت کرے جس طرح اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے۔

(۹) طلبہ کی نگرانی

اُستاذ کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہے کہ درس گاہ اور درس گاہ سے باہر حتی الامکان طلبہ پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ علم میں آگے بڑھ رہے ہیں یانہیں؟ خصوصاً اس مضمون میں جس کو وہ استاذ انہیں پڑھا رہا ہے اور دیکھے کہ کیا وہ درس گاہ میں سبق کے دوران توجہ سے بیٹھتے ہیں؟ کیا وہ محنت کرتے ہیں؟ تکرار اور مطالعہ کرتے ہیں؟ اسباق میں پابندی سے حاضر ہوتے ہیں یانہیں؟ وغیرہ۔ نیز جہاں تک ممکن ہوان کی اخلاقی حالت کا بھی خیال رکھے‘وقتاً فوقتاً ان کے حالات معلوم کرتا رہے کہ وہ درس گاہ سے باہر کیسے رہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی خبر گیری فرماتے تھے‘اگر کسی کو نہ دیکھ پاتے تو پوچھتے کہ فلاں کیوں نہیں آئے؟ اگر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں تو آپؐ ان کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے جاتے۔

(۱۰) عربی زبان کی قدر ومنزلت

ایک طالب علم میں بنیادی طور پر علم کا شوق اوراس کے حصول کا جذبہ ہونا چاہیے‘ تاکہ وہ علم کو اپنا مقصد بنا کر اسے حاصل کرنے کے لیے پوری پوری محنت کرے۔ طالب علم میں علم کا شوق اوراس کی محبت کبھی فطری ہوتی ہے‘افراد کے اعتبار سے اس میں قلت وکثرت کا اعتبار اگرچہ رہتا ہے اور بعض میں یہ شوق بہت ہی کم ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے پیدا کرنے اوراس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس میں استاذ کے عمل اور کردار کو بڑا دخل ہے۔ ایک عقل منداور تجربہ کار استاذ ہی طلبہ میں یہ شوق وذوق پیدا کرسکتا ہے اور اسے مزید آگے بڑھا سکتا ہے۔اس کا اچھا اور آسان طریقہ یہ ہے کہ استاذ تعلیم شروع کرنے سے پہلے اور تعلیم کے دوران وقتاً فوقتاً طلبہ کے سامنے علم اور علماء کے فضائل‘ان کا مرتبہ ومقام‘خصوصاً عربی زبان کی فضیلت اوراس کی اہمیت بیان کرتا رہے اور طلبہ کو بتائے کہ عربی زبان کی قدر ومنزلت دینی‘اجتماعی اور سیاسی ہر اعتبار سے بہت اونچی ہے۔

عربی زبان قرآنِ کریم اور وحی کی زبان ہے۔ نبی کریم ﷺ کی زبان ہے جو سب سے زیادہ فصیح وبلیغ اور جَوَامِعُ الکَلِم کے حامل تھے‘لہٰذا شرعی احکام کو اس کے صاف ستھرے مصادر سے براہِ راست حاصل کرنے اور اسلامی ثقافت کو اسلام کی علمی تُراث سے حاصل کرنے کے لیے عربی زبان پر دسترس ضروری ہے۔خصوصاً اسلام کے دَور سے پہلے کی عربی زبان جس میں یہ قرآن نازل ہوا‘اس سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے‘ کیوں کہ یہی لوگ اس کے پہلے مخاطب تھے‘اس لیے ایک مسلمان طالب علم کے سامنے عربی سیکھنے کا یہی اعلیٰ مقصد ہونا چاہیے۔

جہاں تک عربی زبان کی اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اہمیت ہے‘تو یہ عرب‘اِسلامی ممالک اور اُمت اِسلامیہ کے مختلف افراد کے درمیان ایمان کے بعد مضبوط ترین رابطہ ہے۔ چنانچہ جب عربی جاننے والے دو مسلمان ایک مشرق اور دوسرا مغرب کا رہنے والا باہم ملتے ہیں‘تو ان کے لیے آپس میں افہام وتفہیم بہت آسان ہوجاتی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے سامنے اپنے دلی جذبات اور محبت کا اِظہار کرسکتا ہے‘ایک دوسرے

کے حالات اور مسائل سے براہِ راست مطلع ہوسکتا ہے‘ جب کہ بسا اوقات عالمی اجنبی خبر رساں ایجنسیاں مسلمانوں کے حالات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں جو ان کے لیے مزید پریشانی کا سبب بنتی ہیں۔ اگر عربی سیکھنے والوں میں ایسے طلبہ بھی ہوں جو علم کے بجائے زبان کو بحیثیت زبان سیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو بھی شوق دلایا جائے کہ اگر وہ کسی عرب ملک میں ملازمت یا سیاحت کے لیے جائیں گے تو وہ عربی زبان جاننے کی بنا پر اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔

اب یہ ایک اچھے تجربہ کار استاذ کا کام ہے کہ عربی کی تعلیم کے دوران ایسے طلبہ کی روحانی اور فکری تربیت کرے اور ان کو دین اور دینی اعمال کی طرف دعوت دے۔ اگر عربی کا استاذ کسی مسجد میں امام اور خطیب ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے مقتدیوں کو عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دے‘ ان کے لیے مسجد یا مسجد سے متصل کسی ہال میں ان کے پڑھانے کا انتظام کرے۔ روزانہ یا ہفتہ میں تین دن ان کو پڑھائے اور ان کی ذہنی اور دینی تربیت کرے۔ اگر عربی کا استاذ کسی غیر مسلم ملک میں ہے اور وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور عربی پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں تو اسے چاہیے کہ ان کے لیے بھی عربی پڑھانے کا انتظام کرے۔ اور دورانِ تعلیم ان کے سامنے نہایت حکمت کے ساتھ اسلام کے محاسن اور اس کی عمدہ اور آسان تعلیمات کا تذکرہ کرتا رہے‘ شاید یہی بات ان کے لیے ہدایت کا سبب بن جائے۔ نبی کریم ﷺ کا وہ فرمان پیش نظر رہے‘ جس میں آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ: ’’اگر اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت نصیب کر دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے‘‘۔ نیز مقتدیوں کو عربی پڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ عربی سیکھنے کے بعد جمعہ کا خطبہ اور نماز میں پڑھی جانے والی سورتیں اور مختلف اوراد کسی درجہ میں سمجھنے لگیں گے۔ اس طرح امام اور مقتدیوں میں بحیثیت استاذ و شاگرد مزید ایک قلبی اور روحانی تعلق بڑھ جائے گا اور ایسے مسائل بھی رونما نہیں ہوں گے جو عموماً امام اور مقتدیوں کے درمیان بُعد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

آخری بات

آخر میں اپنی ان معروضات کی روشنی میں اپنی تعلیمی برادری کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرتا ہوں۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ایک معلم اور استاد کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ معلّمین حضرات حقیقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں: ((اَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ))(۱۴) اور مرتبہ عظیم کے ساتھ عظیم تر ذمہ داریاں بھی انہی پر عائد ہوتی ہیں۔

اس لیے ہم صدقِ دِل سے یہ عہد کریں کہ ہم اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کریں گے جو ایک معلم کامل میں مطلوب ہیں اور اپنے سامنے ہمیشہ معلم کامل ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو بطورِ معیار کے رکھیں گے۔

ہم ان اوصاف کو اپناتے ہوئے اپنی علمی درس گاہوں کا معیار بلند کریں۔ ہمارے مدارس‘ ہمارے اسلامی اسکولز‘ ہماری اسلامی یونیورسٹیاں‘ ہمارے علمی ادارے اپنے تعلیمی معیار میں تربیتی اعتبار سے‘ نظام کے اعتبار سے‘ اخلاق کے اعتبار سے‘ وقار کے اعتبار سے‘ صفائی کے اعتبار سے‘ نظامت کے اعتبار سے اتنے بلند ہوں کہ طلبہ

ان کی طرف کھنچے ہوئے آئیں اور کسی دوسری طرف اپنا رُخ نہ کریں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ جب تم کوئی کام کرو تو اسے خوش اسلوبی سے کرو۔''

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر ہماری کوتاہیوں سے ہمارے علمی اداروں کا معیارِ تعلیم پست ہوا اور ہمارے بچوں نے غیر مسلموں کے تعلیمی اداروں کا رخ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنے دین سے منحرف ہوئے اور اپنے قومی اور وطنی جذبہ سے محروم ہوئے تو اس کا وبال سب پر پڑے گا اور اس کا جواب ہمیں کل اللہ کے سامنے دینا ہوگا۔ اور اس ذمہ داری کا احساس ہر فرد کو ہونا چاہیے، خصوصاً تعلیمی اداروں کے ذمہ دار حضرات اور وزارتِ تعلیم کے سرکردہ افراد کو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو، خصوصاً تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں اور اساتذہ و معلّمین کو معلم کامل ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ **واللّٰہ ولی التوفیق۔**

حواشی

(١) صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب بيان ان تخييرامرأته لايكون طلاقاً الا بالنية۔

(٢) سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم۔

(٣) الفقيه والمتفقه للخطيب:٢/١٢٤۔

(٤) صحيح البخارى، كتاب العلم، باب من اعاد الحديث ثلاثا ليفهم عنه۔

(٥) الفقيه والمتفقه للخطيب:٢/١٢٤۔

(٦) صحيح البخارى، كتاب الجمعة، باب ما جاء فى التطوع مثنى مثنى۔

(٧) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب ما يستعاذ منه فى الصلاة۔

(٨) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان الايمان والاسلام والاحسان۔

(٩) صحيح البخارى، كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا كانوا جماعة۔

(١٠) رواه احمد ومسلم والنسائى۔

(١١) المستدرك للحاكم: ١/٥٥٧۔

(١٢) مسندامام احمد:٥/٢٣٧۔

(١٣) صحيح البخارى، كتاب البيوع، باب فى العطار وبيع المسك۔

(١٤) صحيح البخارى، كتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حُجیّتِ حدیث اور انکارِ حدیث: ایک تجزیاتی مطالعہ (۲)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر☆

احادیث کے بارے میں قاری حنیف ڈار صاحب کے مغالطے

قاری حنیف ڈار صاحب نے آج کل اپنی وال سے احادیث کے بارے میں شکوک وشبہات کی تحریک چلا رکھی ہے کہ جس پر بعض دوستوں نے تبصرہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ محض اعتراض وارد کر دینے سے اگر کوئی کلام مشکوک ٹھہرتا تو سب سے پہلے اللہ کی کتاب مشکوک قرار پاتی کہ خود قرآن مجید کے بیان کے مطابق مشرکین مکہ کے اعتراضات میں سے یہ بھی تھا کہ جہنم میں زقوم کا درخت کیسے ممکن ہے؟ جہنم آگ کا دوسرا نام ہے اور اس میں درخت کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔ پس محض اعتراض سے کوئی کلام مشکوک نہیں ہو جاتا' بلکہ اعتراض کی نوعیت' معیار اور قوت دیکھی جاتی ہے۔

پس منکرینِ حدیث کا یہ قضیہ بہت ہی سطحی ہے کہ بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہیں' اور انسانی کام میں غلطی کا امکان ہے' پس بخاری ومسلم غلط ہیں۔ اگر بخاری ومسلم انسانوں نے مرتب کی ہے تو قرآن مجید کس نے مرتب کیا ہے؟ کیا جو قرآن مجید ہمارے پاس اس وقت موجود ہے' وہ ہمیں براہِ راست حضرت جبرائیل علیہ السلام سے موصول ہوا ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو فرشتوں نے لکھ کر ایک کتاب کی صورت دی ہے؟ کیا اس قرآن مجید کو آسمانوں سے ایسے ہی نازل کیا گیا تھا کہ جس صورت میں اب یہ ہمارے پاس ہے' یعنی وزارتِ اوقاف کے رجسٹرڈ قاریوں کی مہر تصدیق کے ساتھ؟ بلاشبہ انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو یاد کیا' انسانوں نے ہی اس قرآن مجید کو نقل کیا' انسانوں نے ہی اس کو لکھا ہے' انسانوں نے ہی اس کے حرکات اور اعراب لگائے' انسانوں نے اس کے نقطے' رموز اور اوقاف ایجاد کیے' انسانوں نے اس کو رکوعوں اور پاروں میں تقسیم کیا' انسانوں نے ہی اس کو کتابی صورت دی' تو کیا انسانی کام میں غلطی نہیں ہو سکتی؟

یہاں سے ملحد اور مؤمن میں فرق ہو جاتا ہے۔ ملحد اور مستشرق یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید کی تالیف وتدوین ایک انسانی کام ہے' لہٰذا اس میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور ملحدین کی دو صد تحریریں' جو ہمارے علم میں ہیں' اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن مؤمن کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں نے ہی کیا ہے' لیکن خدا نے ان سے کروایا ہے' لہٰذا غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اور حدیث کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ خدا نے اس کی تدوین انسانوں سے کروائی ہے' جبکہ اس کی حفاظت اللہ عزوجل نے اسی طرح فرمائی ہے جیسے قرآن مجید

☆اسسٹنٹ پروفیسر' کامسائس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی' لاہور۔ ای میل : mzubair@ciitlahore.edu.pk
فیس بک: www.facebook.com/hmzubair

کی فرمائی ہے۔ اگر منکر حدیث کو حدیث پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سورج اللہ کے عرش کے نیچے جا کر کیسے سجدہ کرسکتا ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ قرآن کا سورج ایک گدلے پانی کے چشمے میں غروب ہوتا ہے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے بے لباس ہو گئے تھے تو ملحد کو قرآن سے یہ شکایت ہے کہ آدم اور حوا (علیہما السلام) اپنے دشمن (ابلیس) کے سامنے بے لباس ہو گئے؟ اگر منکر حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹی عمر کی لڑکی سے کیسے نکاح کر سکتے ہیں؟ تو ملحد کو یہ شکایت ہے کہ خدا چھوٹے بچے کے قتل کا حکم خضر علیہ السلام کو کیسے دے سکتا ہے؟ اگر منکرِ حدیث کو یہ اعتراض ہے کہ مرتد کی سزا قتل کیسے ہو سکتی ہے؟ تو ملحد کو قرآن مجید سے یہ شکایت ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے پر توبہ کی یہ صورت کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی گردنیں اڑائیں' کیسے خدا کی طرف سے ہوسکتی ہے؟ وعلیٰ ہذا القیاس' حدیث پر کوئی اعتراض ایسا نہیں ہے جو قرآن مجید پر بھی وارد نہ ہوتا ہو۔

ہمارے علم کی حد تک غلام احمد پرویز صاحب' جناب قاری حنیف ڈار صاحب سے زیادہ ذہین' زیادہ محنتی اور زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ یقین نہ آئے تو ان کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ لیکن آج کتنے لوگ ان کے پیروکار ہیں؟ ہاں! لوگ پرویز صاحب کو جانتے ہوں گے' بہت لوگ جانتے ہوں گے' لیکن کن الفاظ میں؟ اور احادیث پر ایمان لانے والے آج بھی لاکھوں نہیں کروڑوں میں ہیں' جیسا کہ ماضی میں ہر دور میں رہے ہیں اور علیٰ وجہ البصیرۃ رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ منکرینِ حدیث میں سے کتنے ہیں کہ جنہوں نے قرآن مجید کا دفاع کیا ہو؟ امر واقعہ یہ ہے کہ ملحدین اور مستشرقین نے قرآن مجید پر جو کیچڑ اچھالا ہے' اس کا بھی علمی و تحقیقی جواب سینکڑوں کتب ومقالات کی صورت میں اگر کسی نے دیا ہے تو یہ وہی لوگ ہیں جو حدیثوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ باقی یہ بات درست ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت تماش بین ہوتی ہے کہ جہاں مداری کا تماشا دیکھیں گے' جمع ہو جائیں گے اور لائک مار چھوڑیں گے۔ لیکن یہ ہجوم ہمیشہ عارضی ہوتا ہے اور ثبات ہمیشہ حق کے لیے ہی ہوتا ہے۔

امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ ائمہ محدّثین' مفسّرین اور فقہاء کی نظر میں

قاری حنیف ڈار صاحب نے اپنے پیش رو مفکّرین کے اس اعتراض کو شدّ و مدّ کے ساتھ دہرایا ہے کہ تابعین کے دور میں احادیث کو سب سے زیادہ نقل کرنے والے امام' ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ ناقابلِ اعتبار شخصیت ہیں' لہٰذا حدیث کا اکثر ذخیرہ ناقابل اعتماد ہے(۴۰)۔ ہم ذیل میں امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۵ھ) کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل' ائمہ محدثین اور ائمہ فقہاء اور ان کے معاصر علماء کی آراء نقل کر رہے ہیں کہ جس سے منکرینِ حدیث کے اس اعتراض کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عليكم بابن شهاب هذا فإنكم لا تلقون احدا اعلم بالسنة الماضية منه

''تم ابن شہاب کو لازمی پکڑو (ان سے استفادہ کرو) کیونکہ گزری ہوئی سنن کے بارے میں ان سے بڑھ کر کوئی جاننے والا نہیں ہے۔''

معروف تابعی قتادہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں:

ما بقی احد اعلم بسنة ماضية من ابن شهاب

''گزشتہ سنن کے بارے میں ابن شہاب سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔''

تابعی مکحول رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۹ھ) فرماتے ہیں:

ما بقی علی ظهرها احد اعلم بسنة ماضية من الزهری

''زمین کی پشت پر گزری ہوئی سنت کے بارے میں زہری رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا ہے۔''

ابوایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۱ھ) فرماتے ہیں :

ما رأيتُ اعلم منه ''میں نے ان سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔''

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بقی ابن شهاب وماله فی الناس نظير

''ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ باقی رہ گئے اور ان کی کوئی مثال اس دنیا میں نہیں ہے۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الزهری احسن الناس حديثا واجود الناس إسنادا

''زہری رحمۃ اللہ علیہ لوگوں میں حدیث کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سند کے اعتبار سے سب سے عمدہ ہیں۔''

امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۷۵ھ) فرماتے ہیں:

''میں نے ابن شہاب زہری سے زیادہ جامع العلوم کسی عالم کو نہیں دیکھا۔''

ابوبکر الہذلی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۷ھ) فرماتے ہیں:

قد جالستُ الحسن وابن سيرين فما رأيتُ احدا اعلم منه يعنی الزهری

''میں حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ کے ساتھ بیٹھا' لیکن میں نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔''

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وكان الزهری ثقة كثير الحديث والعلم والرواية فقيها جامعا

''(محدثین کا کہنا ہے کہ) زہری ثقہ راوی ہے اور کثرت سے علم رکھنے والا' احادیث کو جاننے والا اور احادیث کو نقل کرنے والا ہے۔''

سعید بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

ما كان الا بحرا ''وہ تو علم کا ایک سمندر رہے۔''

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كان الزهری اعلم اهل المدينة ''امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اہلِ مدینہ میں سب سے بڑے عالم ہیں۔''

عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ما رأيت انص للحديث من الزهری

''میں نے حدیث کی سند بیان کرنے میں زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔''

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

قال الدارمی قلتُ له (یعنی یحیی بن معین) الزهری احب إلیك فی سعید بن المسیب او قتادة؟ فقال : کلاهما' فقلتُ فهما احب الیك او یحیٰی بن سعید؟ فقال : کل ثقة

''امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ زہری آپ کو سعید بن مسیّب سے زیادہ محبوب ہے یا قتادہ؟ تو انہوں نے کہا دونوں۔ تو میں نے پھر کہا کہ وہ دونوں آپ کو زیادہ محبوب ہیں یا یحییٰ بن سعید؟ تو یحییٰ بن معین نے کہا: یہ سب ثقہ راوی ہیں۔''

امام علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حفظ العلم علی امة محمد ستة فلأهل مکة عمرو بن دینار ولأهل المدینة ابن شهاب الزهری

''حدیث کا علم اُمتِ محمد میں چھ افراد نے محفوظ کیا: اہلِ مکہ میں سے عمرو بن دینار نے اور اہل مدینہ میں ابن شہاب الزہری نے۔''

امام یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ما بقی عند احد من العلم ما بقی عند ابن شهاب

''کسی ایک کے پاس بھی وہ علم نہیں رہا جو ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہے۔''

امام ابوحاتم الرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اثبت اصحاب انس الزهری

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھنے والوں میں سب سے زیادہ ثابت زہری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔''

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

احسن اسانید تروی عن رسول اللّٰه اربعة منها: الزهری عن علی بن الحسین عن الحسین بن علی عن علی ابن ابی طالب عن رسول اللّٰه ﷺ والزهری عن عبیداللّٰه بن عبداللّٰه بن عتبة بن مسعود عن ابن عباس عن عمر عن رسول اللّٰه ﷺ

''سب سے بہتر اسناد جو کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہیں وہ چار ہیں: زہری' علی بن حسین سے' وہ حسین بن علی سے' وہ علی بن ابی طالب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اور زہری' عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے' وہ عبداللہ بن عباس سے' وہ عمر بن خطاب سے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔''

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

رأی عشرة من اصحاب رسول اللّٰه وکان احفظ اهل زمانه واحسنهم سیاقا لمتون الأخبار وکان فقیها فاضلا

''ابن شہاب الزہری رحمۃ اللہ علیہ نے دس صحابہ کی زیارت کی ہے اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے حدیث کے حافظ تھے اور احادیث کے متون کو بیان کرنے میں سب سے اچھے تھے اور فقیہہ اور فاضل تھے۔''

امام احمد العجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تابعی ثقة ''تابعی اور ثقہ تھے۔''

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الفقیه الحافظ متفق علی جلالته وإتقانه

''ابن شہاب زہریؒ فقیہہ اور الحافظ ہیں، علمِ حدیث میں ان کی بزرگی اور حافظے کی پختگی پر محدثین کا اتفاق ہے۔''

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

محمد بن مسلم الزهری الحافظ الحجة ''محمد بن مسلم الزہری رحمۃ اللہ علیہ الحافظ اور الحجۃ ہیں۔''

ان تمام اقوال کے حوالہ جات اور اس بارے میں تفصیل ہماری کتاب فکر غامدی میں موجود ہے۔(۴۱)

امر واقعہ یہ ہے کہ امام المحدثین، امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کی تعدیل و توصیف سے اسماء الرجال کی کتب بھری پڑی ہیں۔ اب امام ابن شہاب الزہری رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر فقہاء، محدثین اور ائمہ دین کی شہادت ان کے حق میں ہم رد کر دیں کہ وہ حدیث کے امام تھے اور آج کے ان جدید محققین یا متجددین کی گواہی قبول کر لیں کہ جو تیرہ صدیوں بعد انہیں حدیث میں ناقابلِ اعتماد کہہ رہے ہیں!

کتبِ احادیث میں شیعہ راویوں سے روایت

احادیث کی اکثر کتابوں میں شیعہ راویوں سے بھی روایت لی گئی ہے اور منکرین حدیث کا حدیث پر ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ شیعہ راویوں سے روایت کیوں؟ قاری حنیف ڈار صاحب نے بھی اس اعتراض کو مرچ مسالہ لگا کر دہرایا ہے۔ اس اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی تدوین تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہوئی ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں جو تشیع تھا، کیا وہ یہی تھا جو آج چودھویں صدی ہجری میں ہے؟ محدثین نے شیعہ راویوں سے روایت اس لیے لی ہے کہ شروع میں تشیع محض ایک سیاسی رجحان تھا جو بنوامیہ کے مقابلے میں اہل بیت کے لیے مسلمانوں کے بعض گروہوں میں موجود تھا۔ اور اس رجحان نے بہت بعد میں غلو کی صورت میں رافضیت کی شکل اختیار کی ہے۔

امام ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ شروع میں تشیع دو قسم کا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے لیکن یہ شیخین ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے تھے۔ اور دوسرا گروہ وہ تھا کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مطلق فضیلت کے قائل تھے۔(۴۲) لیکن ان دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی شیخین یعنی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما یا ازواجِ مطہرات یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب وشتم نہیں کرتے تھے۔ پس بخاری و مسلم میں کسی ایسے شیعہ راوی کی روایت نہیں ہے کہ جو رافضی ہو یا شیخین اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر لعن طعن کرتا ہو، وغیرہ، یا ان کی تکفیر کرتا ہو۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ محدثین بدعت کبریٰ کے مرتکب سے روایت نہیں لیتے ہیں اور بدعت کبریٰ کا ارتکاب کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو شیخین پر زبان درازی کرتے ہیں۔(۴۳) اور محدثین نے تو یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ مذکورہ بالا دو گروہوں میں

سے اس شیعہ راوی سے بھی روایت نہیں لی ہے کہ جو اپنے عقیدے کا داعی اور مبلّغ ہو۔ شارح بخاری اور معروف محدّث علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''تہذیب'' میں یہی بات بیان کی ہے۔

مزید اگر کسی کو شیعہ راوی سے محدثین کے روایت کرنے کے اصولوں کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہو تو اس موضوع پر محمد خلیفہ الشرع کی کتاب ''منهج الإمامين البخارى ومسلم فى الرواية عن رجال الشيعة فى صحيحيهما'' اور کریمہ سودانی کی کتاب ''منهج الإمام البخارى فى الرواية عن المبتدعة من خلال الجامع الصحيح : الشيعة أنموذجا'' کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

منکرینِ حدیث کون ہیں؟

دوست نے کہا کہ چند حدیثوں کے انکار سے کوئی منکر حدیث تھوڑا ہو جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہاں! ٹھیک کہتے ہو، چند آیتوں کے انکار سے کوئی منکرِ قرآن تھوڑا ہو جائے گا؟ اُس نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا کہ وہی بات ہوئی کہ جو آپ نے کی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے اور اس کے ثبوت پر محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہو تو اس ایک روایت کا انکار کرنے والا بھی منکر حدیث ہی کہلائے گا۔

یہ امت اپنی اجتماعی حیثیت میں معصوم ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے ''شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' بنایا ہے(۴۴) اور یہ شہادت اس دنیا میں تو اسی صورت قائم ہو سکتی ہے جبکہ یہ اُمت اجتماعی حیثیت میں معصوم قرار پائے۔ اگر امت اپنی اجتماعی حیثیت میں بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ دوسروں پر اللہ کے دین کے معاملے میں کبھی گواہ نہیں بن سکتی۔

صحیح بخاری کے قلمی نسخے

اہلِ تشیع اور منکرینِ حدیث اہلِ سنت سے صحیح بخاری کے اصل قلمی نسخے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو نوے ہزار لوگوں نے ان کی زندگی میں ان سے سنا(۴۵)۔ تو اب بھی انہیں قلمی نسخے کی ضرورت ہے کیا؟ بھئی! ایسا قلمی نسخہ تو قرآن مجید کا بھی ہمارے پاس نہیں کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھوا کر گئے ہوں۔ نہ جمع ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ موجود ہے، نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نسخہ، بلکہ جو کچھ قدیم مصاحف میں سے موجود ہے تو وہ پہلی یا دوسری صدی ہجری کے مصاحف ہیں۔ تو کیا صرف اس بات پر قرآن مجید کا انکار کر دو گے؟

اگر قرآن مجید قولی تواتر سے ثابت ہو سکتا ہے تو صحیح بخاری نہیں؟ اب نوے ہزار کی روایت سے تواتر حاصل نہ ہو گا کیا؟ اور قرآن مجید کی طرح بخاری کے حفاظ ہر دور میں رہے ہیں اور خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے تو ان کے شاگرد جو خود کبار محدثین تھے، ہزاروں روایتوں کے حافظ نہیں ہو سکتے تھے کیا؟ حفظ تو کجا آج بھی بلادِ مغرب مراکش وغیرہ میں صحیح بخاری کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارا دین اصل میں حفظ و نقل، تحمل و اداء اور تلقی و تلاوت سے منتقل ہوا ہے نہ کہ کتابت سے۔ کتابت تو اس کے انتقال کا ایک اضافی ذریعہ رہا ہے۔ لہٰذا دین میں کتابت کی شرط لگائیں گے تو قرآن مجید تک غیر محفوظ ہو جائے گا کہ اس وقت دنیا میں تین نسخے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں دعویٰ ہے کہ وہ مصحف عثمانی ہے اور تینوں نسخوں پر ''فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ'' کے الفاظ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے نشانات

ہیں۔ پس قرآن مجید اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے جن چیزوں پر لکھا گیا' وہ آج ہمارے پاس محفوظ نہیں ہیں' البتہ ان صحف سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مصحف تیار ہوا۔ آج حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مصحف بھی موجود نہیں ہے' البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مصحف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف تیار ہوئے۔ آج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف بھی موجود نہیں ہیں' البتہ مصاحف عثمانیہ کی روشنی میں تیار ہونے والے مصاحف موجود ہیں۔ (٤٦)

تو ہمارا دین نسخوں سے منتقل نہیں ہوا' یہ نسخے تو کمزور لوگوں کے لیے تیار کیے گئے تھے' جبکہ علماء شروع سے ہی حفاظِ قرآن بھی ہوتے تھے اور حفاظِ حدیث بھی' بلکہ حفاظِ علوم بھی۔ اور آج بھی ہماری درس گاہوں میں حفاظِ قرآن اور حفاظِ حدیث تو کجا تفسیر' نحو اور منطق جیسی درسی کتابوں کے حافظ بھی مل جاتے ہیں۔ اس دین کے نقل ہونے کا طریقہ جس دن آپ کو سمجھ آ جائے گا تو اس دن آپ کا بخاری سے بغض بھی ختم ہو جائے گا۔

صحیح بخاری کا قدیم ترین نسخہ

بعض مفکرین کا دعویٰ ہے کہ ہمارے پاس بخاری کا کوئی ایک بھی محفوظ قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ جو موجود ہیں' ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے کاتبوں نے اپنی طرف سے حدیثیں صحیح بخاری میں شامل کر دیں کہ جسے علمی اصطلاح میں 'الحاق' کہتے ہیں۔ لہٰذا آج ہمارے پاس جو بخاری موجود ہے' وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی چھوڑی ہوئی صحیح بخاری نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے نوے ہزار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی کہ جن میں سے محمد بن یوسف الفربری' ابراہیم بن معقل النسفی' ابن سویہ حماد بن شاکر' منصور بن محمد البزدوی اور حسین بن اسماعیل المحاملی رحمۃ اللہ علیہم امام بخاری سے صحیح بخاری روایت کرنے میں معروف ہیں۔ (٤٧)

محمد بن یوسف الفربریؒ نے تین سال تک امام بخاریؒ سے صحیح بخاری کی سماعت فرمائی اور الفربریؒ سے بے شمار لوگوں نے صحیح بخاری کی سماعت کی' لیکن ان سے صحیح بخاری کو روایت کرنے میں جو لوگ معروف ہیں' ان میں ابراہیم بن احمد المستملی' ابن حمویہ عبداللہ بن احمد' محمد بن مکی الکشھمینی' ابن شبویہ محمد بن عمر' سعید بن عثمان البزار' محمد بن احمد المروزی اور محمد بن محمد الجرجانی رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ (٤٨) الفربری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد المستملیؒ کہتے ہیں :

انتسختُ كتاب البخاری من أصله كما عند ابن يوسف' فرأيتُه لم يتم بعد' وقد بقيت عليه مواضع مبيضة كثيرة' منها تراجم لم يثبت بعدها شيئا' ومنها أحاديث لم يترجم عليها' فأضفنا بعض ذٰلك إلٰى بعض (٤٩)

''میں نے صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخے سے نقل کیا ہے جو کہ الفربری کے پاس تھا۔ میں نے وہ نسخہ دیکھا کہ وہ ابھی تک مکمل نہیں تھا اس معنی میں کہ اس میں کچھ جگہیں خالی تھیں۔ بعض مقامات پر ترجمۃ الباب تھا لیکن اس کے نیچے کوئی حدیث نہیں تھی اور بعض مقامات پر احادیث تھیں لیکن ان پر ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو ہم نے وہ ترجمۃ الباب کہ جس کے نیچے احادیث نہیں تھیں' اسے وہاں درج کر دیا کہ جہاں احادیث تھیں لیکن ترجمۃ الباب نہیں تھا۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی میں ہی صحیح بخاری لکھوا چکے تھے اور انہوں نے اسے مکمل کرنے کے بعد امام

احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہم جیسے جلیل القدر ائمہ محدثین کی خدمت میں پیش بھی کیا تو ان تمام محدثین نے چار احادیث کے علاوہ جمیع احادیث کو صحیح قرار دیا۔ اسی طرح الفربریؒ سے روایت ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنی صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں لکھی ہے کہ جس سے پہلے غسل کر کے دو رکعت نماز استخارہ نہ پڑھی ہو۔ تو یہ بہت واضح دلیل ہے کہ صحیح بخاری کو امام صاحب اپنی زندگی میں مکمل کر چکے تھے۔

البتہ بعض تراجم بیان کر کے امام صاحب ان کے تحت کوئی حدیث لانا چاہتے تھے لیکن جب نہیں ملی تو انہوں نے اس کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ یا بعض احادیث پر وہ کوئی جامع ترجمۃ الباب قائم کرنا چاہتے لیکن جب ان کے ذہن میں ان احادیث سے اخذ ہونے والے متنوع مسائل کے لیے کوئی جامع ترجمۃ الباب نہیں آیا تو انہوں نے ترجمۃ الباب کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ اب الفربری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں نے یہ کام کیا کہ جہاں ترجمۃ الباب کے نیچے احادیث نہیں تھیں، اس ترجمۃ الباب کو وہاں سے اٹھایا اور وہاں رکھ دیا کہ جہاں احادیث تھیں اور وہاں ترجمۃ الباب نہیں تھا۔ تو صحیح بخاری میں کسی نے کوئی اضافہ یا الحاق نہیں کیا، البتہ یہ ہوا ہے کہ تقدیم و تاخیر کر دی ہے۔ اسی لیے ابوالولید الباجی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ الفربریؒ سے جن چار لوگوں نے صحیح بخاری کو روایت کیا ہے، ان کی روایت میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے کہ حدیثیں آگے پیچھے ہیں یا ترجمۃ الباب آگے پیچھے ہے۔ اور یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جو موجب طعن ہو۔ (۵۰)

مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ فیض الباری میں لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کے انیس قدیم نسخے ہیں کہ جن میں تین تو امام بخاری کے حنفی شاگردوں کے ہیں کہ جن میں ابراہیم بن معقل النسفی الحنفی اور حماد بن شاکر الحنفی رحمۃ اللہ علیہما دونوں امام بخاری کے براہِ راست شاگرد ہیں۔ اور تیسرا شمس الدین صغانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ (۵۱)

امام بخاری سے اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر بغض رکھنے والوں کی خدمت میں

بعض مفکرین صحیح بخاری کی بعض احادیث کو بنیاد بنا کر امام بخاریؒ سے جو بغض کا اظہار کر رہے ہیں تو اس کا سبب اللہ کے رسول ﷺ کی محبت بیان کر رہے ہیں۔ تو ان سے عرض ہے کہ کبھی تنہائی میں اس پر غور کرنا کہ کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان روایات یا احادیث کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کے سبب اللہ کے رسول ﷺ کی نظروں میں قیامت والے دن ایسے ہی مبغوض ٹھہریں گے جیسا کہ آج اس دنیا میں تمہارے دلوں میں ان کے بارے میں کینہ ہے؟ اگر ہاں تو اللہ تعالیٰ کبھی صحیح بخاری کو وہ مقام نہ دیتا جو اسے اس امت میں حاصل ہے کہ مبغوضِ رسول، رسول ﷺ کی پہچان کا مقبول اور معروف ترین واسطہ بن جائے، ممکن نہیں ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر اپنے آپ کو سمجھاؤ کہ جب آخرت میں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے محبین میں سے ہوں گے تو پھر تم بخاری کے تذکروں سے اپنا خون کیوں جلا رہے ہو؟ ریلیکس رہو، کھاؤ پیو، لائف کو انجوائے کرو۔ اور بخاری کے بغض میں اپنے عشقِ رسول کی تشہیر کی بجائے کوئی مثبت کام کر لو تو سب روایت پسند تمہارے لیے دعائیں کریں گے۔

صحیح بخاری کا مقام: علمائے دیوبند کی نظر میں

ذیل میں صحیح بخاری کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کو موصول ہونے والا ایک سوال اور

دارالافتاء کی جانب سے دیا گیا جواب نقل کیا جارہا ہے۔

سوال: صحیح بخاری شریف ایک صحیح کتاب ہے' کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل یا ثبوت ہے؟ برائے کرم قرآن اور حدیث یا اقوال یا اسلامی کتابوں سے' صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دلیل عنایت فرماویں کہ صحیح بخاری شریف ایک مستند کتاب ہے' اور دلیل یا ثبوت ان لوگوں کی جانب سے نہیں ہونے چاہئیں جو کہ تبع تابعین کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

جواب: بخاری شریف اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر قرآنِ کریم کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے۔ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ اور اصحابؓ کے زمانے میں تو تھی نہیں' تو پھر بخاری شریف کے بارے میں فرمانِ نبویؐ اور اقوالِ صحابہؓ کہاں ملیں گے؟ البتہ بخاری شریف یہ آپ ﷺ کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس میں بھی وہ احادیث ہیں جن کی صحت میں شبہ نہیں۔ واضح رہے کہ احادیث سب ہی صحیح ہوتی ہیں' اس میں جو ضعف آتا ہے وہ راویوں کی وجہ سے آتا ہے۔ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو احادیث نقل کی ہیں' اس میں راوی وغیرہ انتہائی ثقہ ہیں' جس سے اس میں موجود احادیث کے حدیث رسول ہونے میں شبہ نہیں رہ جاتا۔ اور جو بات حدیث ہو اس کے صحیح ہونے میں قرآن کی آیات بھی ہیں' احادیث بھی ہیں' اقوالِ صحابہ بھی ہیں۔ بخاری شریف کی صحت پر اجماعِ امت ہے' اور اجماع یہ حجت شرعیہ ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے معاصرین اور اس کے بعد کے معتبر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ بخاری لکھنے کا آغاز ۲۱۷ھ میں ہوا اور سولہ سال میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ (۵۲)

کیا صحیح بخاری منزّل من اللہ ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں؟

جب بھی حدیث کا دفاع کیا جائے تو منکرین حدیث عموماً یہ سوال کرتے ہیں۔ تو پہلی بات یہ واضح رہے کہ صحیح بخاری کے دو گتوں کے مابین جو کچھ ہے' اس سب کو کوئی بھی ''منزل من اللہ'' نہیں کہتا۔ صحیح بخاری میں ''منزل من اللہ'' ہے نہ کہ کُل صحیح بخاری ''منزل من اللہ'' ہے۔

دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو وحی کہا جاتا ہے نہ کہ صحیح بخاری کو۔ اور صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے نہ کہ صحیح بخاری کی ہر بات حدیث ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایت ہے کہ جس میں اللہ کے رسول ﷺ کا قول' فعل اور تقریر موجود ہو اور صحیح بخاری میں صحابہؓ کے اقوال بھی ہیں اور تابعینؒ کے بھی۔ سلف کے اقوال بھی ہیں اور ائمہ کے بھی۔

تیسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ حدیث کو لفظی وحی کوئی بھی نہیں کہتا بلکہ حدیث معنوی وحی ہے۔ پس حدیث کا معنی ''منزل من اللہ'' ہے جبکہ حدیث کے الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہوتے ہیں اگر وہ قولی سنت ہو۔ اور اگر فعلی یا تقریری سنت ہو تو حدیث کے الفاظ صحابی کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور بہت حد تک محفوظ بھی ہیں لیکن اصل بات یہی ہے کہ اس میں معنی محفوظ ہے۔

منکرینِ حدیث عموماً اپنی نقد میں ان اصولی باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر وہ صحیح بخاری پر یوں نقد کریں گے کہ اس میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک بندر نے زنا کیا تو بقیہ بندروں نے اس کو رجم کر دیا(۵۳)۔ اب

امام بخاریؒ نے اس واقعے کو عمرو بن میمون تابعیؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ یمن میں ایسے ایسے دیکھا۔ اور وہ دیکھا بھی زمانۂ جاہلیت میں ہے۔ اب یہ حدیث ہے ہی نہیں بلکہ ایک تابعی کا مشاہدہ ہے' اگرچہ واقعہ بخاری میں موجود ہے۔

رہی بات صحیح بخاری پر نقد کی تو ائمہ فن نے اس کی روایات پر نقد کی اور ائمہ فن نے ہی اس نقد کا جواب بھی دے دیا ہے۔ اور اب اس نقد اور دفاع سے یہ متعین ہو گیا ہے کہ صحیح بخاری میں کلام کی گنجائش کہاں کہاں ہے اور اس کا جواب کیا کیا ہے؟ یہ عمل علم کی دنیا میں ایک ہزار سال کے عرصے میں مکمل ہو چکا۔ اب آپ صحیح بخاری پر کوئی نیا اعتراض پیدا نہیں کر سکتے اور جو پیدا ہوئے تھے' ان کا جواب موجود ہے۔

اسی لیے صحیحین کی احادیث پر نقد کے بارے میں اپنے ایک مفصل مضمون کا خلاصہ یہاں نقل کر رہا ہوں(۵۴) کہ صحیحین پر ہونے والی کبار محدثین کی تمام نقد اور کبار محدثین ہی کی طرف سے اس کے جواب کے بعد ان دونوں کتب میں وہ مقامات متعین ہو گئے کہ جن میں کوئی علل پائی جاتی ہیں اور ان علل کے درجہ کا تعین بھی ہو گیا ہے کہ وہ علل قادحہ ہیں یا نہیں؟ اب اگر کوئی شخص امام الدارقطنیؒ یا ائمہ سلف میں سے کسی اور محدث کی بیان کردہ تحقیقات کی روشنی میں صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی کسی حدیث پر نقد کرتا ہے تو اس کی یہ تنقید صحیحین پر کوئی مستقل بالذات تنقید شمار نہ ہو گی اور ایسی تنقید کا ائمہ سلف ہی میں سے بہت سے ائمہ نے کافی وشافی جواب دے دیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص صحیحین کی کسی ایسی روایت پر تنقید کرتا ہے کہ جس پر ائمہ سلف میں سے کسی نے بھی کلام نہ کیا ہو تو ایسا شخص اجماع محدثین کی مخالفت کر رہا ہے' کیونکہ جن روایات پر محدثین نے نقد نہ کی تو اس سے یہ طے ہو گیا کہ تمام محدثین کے نزدیک یہ روایات صحیح ہیں لہٰذا ان روایات پر کلام کرنا جمیع محدثین کے دعوائے صحت کو چیلنج کرنا ہے اور ایسا دعویٰ ہی ناقابل التفات ہے چہ جائیکہ اس کی تحقیق کی جائے۔

نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی متفق علیہ روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال تھی جبکہ رخصتی کے وقت نو سال تھی(۵۵)۔ اس روایت پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ظلم ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس پر ظلم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے' اس سے کوئی نہیں پوچھ رہا۔ یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال کی عمر میں رخصتی پر راضی' ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ اس پر راضی' ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے کسی فرد کو اعتراض نہیں' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی۔ اب انہیں' دوسری دنیا کے لوگوں کو' یہ ظلم نظر آ رہا ہے!

قاری حنیف ڈار صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ تو مانتے ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھ سال کی عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں' لیکن اپنی بیٹی چھ سال کی عمر میں کسی کے نکاح میں نہیں دیتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! واللہ! اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو چھ سال کی عمر میں اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دینے میں آج بھی لاکھوں اپنے لیے سعادت سمجھتے۔ قاری حنیف ڈار صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ عام انسان اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ فرق سمجھیں۔ ایک امتی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ایمانی تعلق ہے' اسے کسی مرشد اور پیر سے جذباتی

تعلق پر قیاس نہ کریں۔ حضرت عائشہ ؓ جو خود اس روایت کی راویہ ہیں' انہوں نے کبھی اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ نو سال کی عمر میں کیوں اللہ کے رسول ﷺ کی زوجیت میں آئیں؟ اور بعض لوگوں کو خواہ مخواہ کا بخار چڑھا جا رہا ہے۔

ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ اُمتی تو اپنی بیٹی دے دے گا لیکن رسول ﷺ لے نہیں سکتے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اتنے لوگ اگر کہہ رہے ہیں اور اتنی روایات اگر بیان کر رہی ہیں تو امکان تو ہے کہ قیامت کے دن معلوم ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا تو اُس وقت رسول کا رسول ہونا کیسے جسٹیفائی کرو گے؟ حضرت عائشہ ؓ نو سال کی عمر میں اللہ کے رسول ﷺ کے نکاح میں آئیں' اس کا جواب چاہیے تو وہ عقلی نہیں' ایمانی ہے۔ آج اپنے آپ سے یہ سوال کر لیں کہ اگر بالفرض تم سے اللہ کے رسول ﷺ تمہاری بیٹی نو سال کی عمر میں مانگ لیتے تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا؟ اور پھر یہ کہ تمہارا ردعمل جو ہوتا سو ہوتا لیکن یہ بھی سوچ لو کہ اگر ابوبکر ؓ کا ایمان ہوتا تو اس کا اس پر کیا ردعمل ہوتا؟

ہمیں یہ کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ مغربی عقلیت پرستی کے زیر اثر کچھ لوگوں کو یہاں مشرق میں جذبات کی مخالفت کا بخار چڑھا ہوا ہے' حالانکہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ ایمان بھی ایک جذبہ ہی ہے۔ کائنات کا کل حسن جذبات میں ہے' اگر ایسا نہیں تو ہر زبان کے ادب کو اٹھا کر دریا میں پھینک دو۔ ہاں' ہاں' یہ کیا' جذباتی بات کر رہے ہو۔ تو کیا جذبات کے بغیر تمہارا ایمان مکمل تو کجا موجود بھی ہو سکتا ہے؟

ہماری نظر میں ہر سوال کا جواب نہ تو علمی ہوتا ہے اور نہ عقلی۔ بعض سوالوں کا جواب صرف ایمانی ہوتا ہے' جو صرف ایمان سے ہی دیا جا سکتا ہے اور محض ایمان ہی کی بدولت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور مذہب کو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے' کیونکہ یہ تکمیل ایمان میں سے ہے۔ ایک دوست کا کیا خوب کہنا ہے کہ ایمان دلیل بھی ہے اور مدلول بھی' لیکن اس جملے کو سمجھنے کے لیے بھی ایمان چاہیے۔

حضرت عائشہ ؓ کی عمر پر تحقیقی نظر از سید سلیمان ندوی ؒ

اپنے اس رسالے میں جناب سید سلیمان ندویؒ نے اپنے معاصرین میں سے منکرین اور متجددین کے ان دلائل کی خوب خبر لی ہے کہ جن سے یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ ؓ کی عمر بڑی تھی۔ یہ رسالہ سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہ ؓ کے آخر میں موجود ہے جسے مکتبہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ منکرین اور متجددین نے حضرت عائشہ ؓ کی عمر کے بارے میں صاحبِ مشکوٰۃ ولی الدین خطیب ؒ کے ایک رسالہ ''**الاکمال فی أسماء الرجال**'' کی ایک عبارت کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ جس کے مطابق حضرت عائشہ ؓ اپنی بہن سیدہ اسماء ؓ سے دس سال چھوٹی تھیں(۵۶)۔ صاحبِ مشکوٰۃ کے رسالہ ''**الاکمال فی أسماء الرجال**'' کی عبارت کے بارے میں سید صاحب کا کہنا ہے کہ صاحبِ مشکوٰۃ نے اس رائے کو ''قیل'' کے صیغے سے پیش کر کے اس کے مجہول اور ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن منکرین اور متجددین نے اسی قول کو اپنے حق میں دلیل بنا لیا۔ جبکہ صاحب مشکوٰۃ کی اپنی رائے اس باب میں وہی ہے جو عام علماء کی رائے ہے کہ سیدہ عائشہ ؓ کا نکاح چھ سال کی عمر میں اور رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی تھی۔(۵۷)

سید صاحب نے لکھا ہے کہ احادیث میں صرف نو کا عدد نہیں ہے کہ جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ یہ انیس تھا اور راویوں نے اسے نو سمجھ لیا بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نکاح کے وقت کے احوال بھی بیان کیے ہیں کہ وہ ہنڈولے جھولتی تھیں، گڑیاں کھیلتی تھیں، اور ایک روایت میں ''جارية حديثة السن'' کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی طرح طرح کے الفاظ اور قرائن سے نکاح کے وقت ان کے چھوٹے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔(۵۸)

سید صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ عربوں میں نہ صرف کمسن بچیوں کے نکاح کا رواج تھا بلکہ شیر خوار بچوں کا بھی وہ نکاح کر دیتے تھے، بلکہ ان بچوں کا بھی ان کے ہاں نکاح کر دیا جانا عام تھا کہ جو ابھی حمل میں ہوتے تھے۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد میں تو باقاعدہ ایک باب ''باب في تزويج من لم يولد'' کے عنوان سے موجود ہے کہ جس میں ان بچیوں کے نکاح کا تذکرہ ہے کہ جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

سید صاحب نے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے کمسن لڑکے سلمہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نابالغ لڑکی سے پڑھایا تھا۔ سید صاحب نے علامہ عینیؒ سے نقل کیا ہے کہ قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی نومولود لڑکی سے نکاح پڑھوایا تھا۔ سید صاحب کا یہ رسالہ اس موضوع پر ایک تحقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔(۵۹)

حدیثوں پر غیرت اور ان کا انکار

عجب حال ہے کہ جنہیں حدیثوں پر غیرت آتی ہے اور اس غیرت کے سبب حدیثوں کا انکار شروع کر دیتے ہیں، انہیں قرآن کریم کی آیتوں پر غیرت نہیں آتی بلکہ وہاں ایمان یاد آ جاتا ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکی کا نکاح تسلیم نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث میں آیا ہے، لیکن چھوٹی عمر کے لڑکے کو بلاوجہ قتل کرنے پر ہم ایمان لائیں گے کہ یہ قرآن میں آیا ہے۔ یہ وہ تذبذب ہے کہ جس کا شکار آج کل کے منکرین حدیث اور متجددین ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کا نابالغ بچے کو قتل کرنا، حضرت جبرائیلؑ کا سیدہ مریمؑ کی تنہائی میں مرد کی صورت میں آ جانا، حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں کو اپنی قوم پر پیش کرنا وغیرہ جیسے قرآنی واقعات میں توہین، عقل، منطق سب بھول جاتا ہے، صرف ایمان یاد رہ جاتا ہے۔ تو غیرت، عقل اور منطق کے جس ترازو سے حدیث کو تول رہے ہیں، اسی ترازو سے اگر قرآن مجید کو بھی تولیں گے تو اپنے دامن میں کچھ نہیں بچے گا سوائے الحاد کے!

اور حقیقت یہی ہے کہ رویے اصل میں دو ہی ہیں یا ایمان یا الحاد۔ اور جو ان کے بیچ کا ہے تو وہ یا تو منافقت ہے یا پھر وسعت مطالعہ کی کمی ہے کہ حدیث کے خلاف جتنے اعتراضات سوجھ رہے ہیں، وہ سب قرآن مجید کے خلاف مستشرقین بہت پہلے ہی نقل فرما چکے ہیں۔ قرآن بھی خبر ہے اور حدیث بھی خبر ہے۔ خبر کے اصولوں پر دونوں کو پرکھ لیں۔ اگر حدیث کو غیرت اور عقل کے اصولوں پر پرکھیں گے اور اپنے اس رویے میں مخلص ہوئے تو ضرور بالضرور قرآن کا بھی انکار کریں گے کہ قرآن میں وہ باتیں زیادہ صراحت سے موجود ہیں کہ جن کا آپ احادیث میں انکار کر چکے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ اگر حدیث میں منقول ہوتا تو لازماً اس کا انکار کر دیا جاتا، لیکن چونکہ قرآن مجید میں نقل ہو گیا تو اب درایت و روایت کے سارے اصول بھول گئے اور محیّر العقول تفصیلات

اور خلاف عقل امور کو کلام الٰہی تسلیم کر لیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین کے ثبوت کا اصل ذریعہ خبر مقبول ہے۔ اور جب خبر مقبول سے دین ثابت ہو گیا تو چاہے وہ خبر قرآن مجید کی ہو یا حدیث کی' اس کو ماننا پڑے گا کہ یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اور کئی اور مقامات پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ (۶۰)

لڑکی کی رضامندی کی قانونی عمر

مختلف ممالک میں لڑکی سے رضامندی کا تعلق (the age of consent) قائم کرنے کے لیے مختلف عمروں کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ شمالی امریکہ' فلپائن اور انگولا میں یہ قانونی عمر ۱۲ سال ہے اور جاپان' ایران' نائیجر اور ارجنٹینا میں یہ عمر قانونی طور پر ۱۳ سال ہے۔ جرمنی' آسٹریا' بلغاریہ' ہنگری' پرتگال' مقدونیہ' ایسٹونیا' البانیا' بوسنیا' اسرائیل' چین' بنگلہ دیش وغیرہ میں یہ ۱۴ سال ہے۔ اور ۱۵ اور ۱۶ سال کی قانونی عمر تو آدھی سے زیادہ دنیا میں ہے (۶۱)۔ اور یہ تو آج کی متمدن دنیا کے ہم احوال بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ ان قوموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم پڑتا ہے کہ اس قانونی عمر کا تقرر بھی اچھی خاصی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

یہ بحث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غلامی کے بارے میں مصادرِ احادیث میں جو روایات مروی ہیں' اگر ان کا تقابل آج کل کے تصورِ آزادی سے کریں گے تو اسلام پر طعن کرنا بہت آسان ہو جائے گا' لیکن اگر احادیث میں مروی غلامی کے تصور کا اُسی دور کی معاصر اقوام میں رائج غلامی سے تقابلی مطالعہ کریں گے تو اسلام سے بڑی نعمت کوئی نہ معلوم ہو گی۔ پس ایک یہ ہے کہ اُس دور میں نکاح اور شادی بیاہ کے بارے میں کلچر اور رسوم و رواج کیا تھے؟ اور ایک یہ ہے کہ آج کے رسوم و رواج اور ثقافت کیا ہے؟ تو ظاہری بات ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی بات کو دیکھنے کے دسیوں زاویے ہو سکتے ہیں' لہٰذا ایک ہی زاویے سے کسی بات کو دیکھ کر اس پر کوئی قطعی حکم لگا دینا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔

ناقدین کو حدیثوں میں ایک مثال ملی تو چڑھائی کر دی کہ نو سال میں شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ تو یہ جو ایشیا' افریقہ اور جنوبی امریکہ میں بارہ اور تیرہ اور یورپ میں چودہ سال کی عمر میں قانون کی چھتری تلے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے' کبھی اس پر سوال یا اعتراض کی جرأت ہوئی کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ تیرہ یا چودہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو کیا اپنی بیٹی کا نکاح اس عمر میں کرنا پسند کریں گے؟ یہ وہ انداز ہے کہ جو منکرینِ حدیث عام طور پر حدیث پر اعتراض کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔

شکریہ قاری حنیف ڈار صاحب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت کی عمر کی متفق علیہ احادیث پر ایک تنقیدی پوسٹ قاری حنیف ڈار صاحب نے لگائی۔ دراصل متقدمین مفسرین' فقہاء اور محدثین کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت ان کی عمر چھوٹی تھی' جیسا کہ روایات میں بیان ہوا ہے اور اس مسئلے میں انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی دلیل پکڑی ہے کہ جس میں ان عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے کہ جنہیں حیض نہیں آیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ

يَحِضْنَ ط﴾ (٦٢)

''تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہوگئی ہوں' اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو۔''

اس دلیل پر پہلے قاری صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ پھر ہم کچھ عرض کریں گے۔

''جو آیت کوٹ کی جاتی ہے سورۃ الطلاق کی (۴)' ذرا اس کی شروعات دیکھئے اور ہمارے بزرگوں کی ترجمانیاں دیکھئے' یہ بات سمجھنے کے لیے مفتی ہونے کی ضرورت نہیں بس عقل ہونے کی ضرورت ہے کہ بات عورتوں کی ہو رہی ہے بچیوں کی نہیں' اور ۸ یا ۹ یا ۱۰ سال کی بچی کو عربی میں کبھی نساء اور اردو میں کبھی عورت نہیں کہتے اور اللہ پاک فرما رہے ہیں کہ تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے خشک ہوگئی ہیں یا وہ کہ جن کو کسی بیماری یا کسی عذر کی وجہ سے حیض آیا ہی نہیں وہ سدا سے خشک ہیں ان کی عدت کی مدت تین حیض کی بجائے تین ماہ ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قول کے علاوہ تابعین میں سے سدی' قتادہ' ضحاک اور مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہم نے قرآنی الفاظ ''لَمْ يَحِضْنَ'' سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جو حیض کی عمر کو نہ پہنچی ہوں۔ علاوہ ازیں امام ابن جریر طبری' امام قرطبی' امام بیضاوی' امام بغوی' امام ابن کثیر' امام سیوطی' امام رازی' امام نسفی' امام ابو حیان الاندلسی' امام ابن عطیہ' امام شوکانی' امام بقاعی' امام ابو السعود' علامہ ابن جوزی' علامہ زمخشری' علامہ مراغی' علامہ مظہری' علامہ صدیق حسن خان' علامہ طنطاوی' علامہ الجزائری اور سید قطب رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ بہت سے عربی مفسرین نے بھی اس آیت سے مراد وہ بچیاں لی ہیں کہ جنہیں چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو۔

پہلے تو انہوں نے ہمارے علم میں یہ اضافہ فرمایا تھا کہ سلف کی قرآن فہمی درست نہیں ہے۔ اور اب ماشاء اللہ! یہ بھی بتلا دیا ہے کہ سلف کو عربی نہیں آتی تھی۔ یعنی ابن جریر طبری' علامہ زمخشری' ابو حیان اندلسی' ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہم جیسے ماہرین لغت اور بلاغت بھی اتنی عربی نہیں جانتے تھے کہ جتنی کامن سینس رکھنے والے گجرات کے ایک قاری صاحب جانتے ہیں۔ شکریہ قاری صاحب! آپ واقعتاً چھا گئے ہیں۔ کیا آج سے ہم اہل عرب سے یہ گزارش کر لیں کہ عربی زبان کے الفاظ انہی معانی میں استعمال کریں کہ جو قاری صاحب نے متعین کر دیے ہوں؟

بکری کے قرآن مجید کی آیات کھا جانے کی روایت

ایک دوست نے سنن ابن ماجہ کی ایک روایت کے بارے میں سوال کیا ہے کہ جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بکری قرآن مجید کی بعض آیات کھا گئی تھی تو کیا یہ صحیح روایت ہے؟ (٦٣) تو اس بارے میں عرض ہے کہ حدیث کی کتابوں میں کوئی حدیث نقل ہو جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ حدیث صحیح بھی ہے۔ صحیحین کے علاوہ کتب احادیث میں ضعیف روایات بھی موجود ہیں اور موضوع (fabricated) بھی۔ جہاں تک مذکورہ بالا روایت کا معاملہ ہے تو محققین نے اس روایت کو محمد بن اسحاق کے تفرد اور مخالفت ثقات کے سبب مردود قرار دیا ہے' لہٰذا ایسا کوئی واقعہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ (٦٤)

اور اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کی وجہ سے قرآن مجید پر کوئی طعن وارد نہیں ہوتا کہ اس روایت میں یہ ذکر ہے کہ جو آیات اس بکری نے کھائی تھیں' وہ منسوخ التلاوۃ آیات تھیں' یعنی رجم کی آیات اور رضاعت کبیر کی آیات۔ اور منسوخ آیات کو ضائع کروا دینا اور ذہنوں سے بھلوا دینا' یہ اللہ کی ذمہ داریوں میں سے ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ ﴾ (٦٥)

''ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ عزوجل ہر بات پر قادر ہے!''

رضاعتِ کبیر کے بارے میں روایات کی صحت

بعض صحیح روایات میں اس کا تذکرہ ہے کہ کسی ضرورت کے تحت کسی بڑے لڑکے کو دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنایا جا سکتا ہے' لیکن کسی بھی صحیح روایت میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی خاتون کسی بڑے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلا سکتی ہے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی برتن میں نکال کر کسی بچے کو پلایا جا سکتا ہے' جیسا کہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الاستذکار'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔(٦٦)

عصرِ حاضر میں تو باقاعدہ انسانی ملک بینک (human milk bank) وجود میں آ چکے ہیں' جیسا کہ امریکہ اور یورپ میں بہت بڑے پیمانے پر انسانی دودھ کو ڈبے کی دودھ کی طرح محفوظ کر کے اس کا کاروبار کیا جا رہا ہے۔ اور کھلاڑی عموماً کھیلوں میں بہتر کارکردگی دکھانے کے لیے انسانی دودھ کا استعمال کرتے ہیں کہ اس میں انرجی زیادہ ہوتی ہے' لیکن یہ سب درست نہیں ہے کہ اس سے رضاعت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم اس بات کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ عورت کا اپنا دودھ نکال کر کسی اور کو پلا دینا یہ ایک عام سی بات ہے۔

رضاعت کبیر سے حرمت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ بعض کا کہنا ہے کہ حرمت ثابت ہوتی ہے' یعنی بڑی عمر کے بچے کو بھی اگر کوئی خاتون دودھ پلا دے تو وہ اس کا رضاعی بیٹا بن جاتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر ضرورت اور نیت ہو تو ثابت ہوتی ہے اور یہ امام ابن تیمیہ' امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہما اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے(٦٧) اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

حدیث میں رضاعت کبیر یعنی بڑی عمر کے بچے کو دودھ پلانے کا جو واقعہ نقل ہوا ہے تو اس میں بھی ضرورت کا بیان ہے۔ ایک صحابی ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک بچے سالم رضی اللہ عنہ کو بچپن سے گود لیا اور جب وہ بالغ ہو گیا تو ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اب مجھے اس سے پردہ کرنا پڑے گا۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتون اور بچے کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دے دیا(٦٨)۔ اب ایک عورت نے ایک بچے کو بچپن سے پالا پوسا ہو تو اس کا اس سے محبت' الفت اور مانوسیت کا ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ گھر کا

ایک فرد بن چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے حالات میں پردہ دین میں ایک مشقت پیدا کر دیتا ہے اور اگر بچے کو گھر سے نکال باہر کریں تو انسانی جذبات کا کیا کریں کہ یہ ایک دوسری بڑی مشقت ہے۔ تو اس کا علاج یہ بتلایا گیا کہ اگر ایسی خاتون ایسے بچے کو اپنا دودھ پلا کر اپنا رضاعی بیٹا بنا لے تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن دودھ کس طرح پلائیں' اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اللہ نے آپ کو کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا تو اللہ کا شکر ادا کریں' ورنہ تو اس اجازت کی اہمیت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس نے کسی سے بچہ لے کر پالا ہو۔ ایمان سے بتائیں کہ ایسا شخص ایسی حدیثوں کو سینے سے نہیں لگائے گا تو اور کیا کرے گا؟

غزوۂ احد میں اللہ کے رسول ﷺ کے دندانِ مبارک کا شہید ہونا

دو دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا وہ روایت صحیح ہے کہ جس میں غزوۂ اُحد میں اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کے دانتوں کے شہید ہونے کا تذکرہ ہے؟ اگر صحیح ہے تو ان روایات کا کیا کریں کہ جن میں ذکر ہے کہ آپ ﷺ جب مسکراتے تو سامنے کے دانت چمکتے تھے؟ اور اس اعتراض کا کیا کریں کہ نبی کی ذات میں کوئی عیب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں قرآن مجید کے تراجم جس محنت سے ہوئے ہیں' احادیث کے تراجم اس قدر محنت اور دِقّتِ نظری سے نہیں کیے گئے۔ یہ اشکال دراصل بعض مترجمین کے ترجمہ سے پیدا ہوا کہ جنہوں نے اس واقعے میں مروی عربی الفاظ ''رباعية'' کا ترجمہ سامنے کے دانت کر دیا ہے کہ جس سے تین غلط تاثر پیدا ہوئے کہ یہ ''ثنایا'' کی بات ہو رہی ہے' اور ثنایا علیا کی' اور دو دانتوں کی بات ہو رہی ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ احادیث کے تقریباً تمام بنیادی مصادر میں موجود ہے (۶۹) بلکہ سیرت اور تاریخ کے بنیادی مصادر میں بھی موجود ہے۔ یہ واقعہ سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام دونوں میں موجود ہے (۷۰) اور ہر دور میں مسلمانوں میں اس قدر معروف اور رائج رہا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس کا انکار کسی سے مروی نہیں ہے۔

''ثنایا'' سامنے کے دانتوں کو کہتے ہیں' جن میں سے دو اوپر والوں کو ''ثنایا علیا'' اور دو نیچے والوں کو ''ثنایا سفلیٰ'' کہتے ہیں۔ جو عام طور پر مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں' وہ ''ثنایا علیا'' ہیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا غزوۂ احد میں ایک دانت مبارک شہید ہوا جو کہ ''رباعیۃ'' تھا یعنی ثنایا کے ساتھ والا دانت تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں جو روایات میں ملتا ہے کہ سامنے کے دانت چمکتے تھے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ثنایا علیا کا ذکر ہے کہ ان سے گویا نور نکلتا تھا (۷۱)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ثنایا بہت چمکدار تھے (۷۲)۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ثنایا علیا میں دو دانتوں کے مابین خلا تھا۔ (۷۳)

یہ تو روایات میں جمع ہو گئی کہ دونوں قسم کی روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جن روایات میں دانتوں کے چمکنے کا ذکر ہے تو وہاں ثنایا کی بات ہو رہی ہے اور غزوۂ اُحد میں جو دانت مبارک شہید ہوا تو وہ رباعی تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ نبی کی ذات میں عیب نہیں ہوتا تو یہ بات درست ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ میں پیدائشی طور

پر کوئی عیب نہیں ہے اور نہ ہی نبوت کے دعویٰ کے وقت ہے کہ لوگوں کو کوئی اشکال پیدا ہو۔

رہا' اللہ کے رسول ﷺ کا غزوۂ اُحد میں دانت مبارک کا شہید ہونا تو یہ عیب نہیں' یہ تو شہادت ہے' نبی ﷺ کے اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہونے کی شہادت کہ جو انہوں نے اپنے وجود سے دی ہے۔ دنیا کی نظر میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مقتول ہو جانے سے بڑا کوئی عیب ہے؟ اور انبیاء کرام علیہم السلام مقتول بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کے لیے مقتول ہونا' چاہے دشمن سے ہو' یہ عیب نہیں ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

چلیں! ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں' کندھوں تک آتے ہیں' ان بالوں کی وجہ سے آپ کی بہت وجاہت ہے' لیکن حج کے موقع پر آپ نے حلق کروالیا تو یہ عیب نہیں ہے کہ اللہ کے لیے قربان ہونے والی شئے عیب دار نہیں' مزید خوبصورت بنا دیتی ہے' لیکن دیکھنے والی آنکھ ایمان کی ہو کہ وہ تو جسم میں اللہ کا حکم دیکھتی ہے' کہ کتنا جاری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی کندھوں تک بال رکھ لیتے تھے اور حلق بھی کروالیتے تھے۔ اور اس حلق سے آپ ﷺ کی خوبصورتی بڑھ جاتی تھی۔

چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹی سے شادی

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ بعض منکرینِ حدیث کا دعویٰ ہے کہ چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں ہے' تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے پوچھا کہ وہ اس دعوے کی کیا دلیل بیان کرتے ہیں؟ تو دوست نے کہا کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۰ کا حوالہ دیتے ہیں۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ﴾

''اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیے ہیں حلال کر دی ہیں۔ اور تمہاری لونڈیاں جو اللہ نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں)۔ اور کوئی مؤمن عورت اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں (وہ بھی حلال ہے لیکن) یہ اجازت (اے محمد ﷺ) خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔''

اب احادیث کا انکار کرنے والوں نے ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ﴾ کہ یہ اجازت اہلِ ایمان کے علاوہ خاص آپ ﷺ کے لیے ہے' کے الفاظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹی سے نکاح کی اجازت صرف آپ ﷺ کے لیے خاص ہے' عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ﴾ کا تعلق صرف ﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ

نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا﴾ سے ہے کہ اگر کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کر دے تو یہ صورت صرف آپ ﷺ کے لیے جائز ہے۔ عام مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت خود سے اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کر دے کہ اس عورت سے تمتع اس کے لیے جائز ہو جائے۔ ہبہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے ولی کی اجازت اور حق مہر کے بغیر نبی کے نکاح میں آنا چاہے تو ایسا جائز ہے' لیکن یہ حکم بھی عارضی تھا کہ بعد میں ﴿لَّا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بَعْدُ﴾ کے حکم کے ذریعے مزید کسی بھی قسم کے نکاح سے آپ ﷺ کو روک دیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا تعلق تمام آیت سے مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ شروع آیت میں جو بیان ہے کہ وہ بیویاں کہ جن کے حق مہر ادا کیے گئے ہوں' وہ بھی صرف نبی ﷺ کے لیے ہی حلال ہوں گی۔ اور اس طرح منکر حدیث کے لیے اس کی کوئی بھی بیوی کہ جس کا حق مہر وہ ادا کر چکا ہو' حلال نہ رہے گی۔ تیسری بات یہ کہ ﴿خَالِصَةً﴾ جو کہ نصب میں ہے حال ہے' ﴿وَامْرَاَةً﴾ سے جو کہ اس کا ذوالحال ہے' لہٰذا وہ معنی جو کہ منکرِ حدیث بیان کر رہا ہے' عربی زبان اور گرامر کے خلاف ہے۔ اور حال اور صفت میں فرق یہ ہے کہ حال عارضی ہوتا ہے جبکہ صفت میں دوام ہوتا ہے' جیسا کہ ہنسنا انسان کا حال ہے جبکہ گورا ہونا صفت ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۲۴ میں عام مسلمانوں کے لیے محرمات کی فہرست بیان کر کے باقی سب کو حلال کر دیا گیا۔ اور باقی سب میں چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹی بھی شامل ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ آل بیت میں ایسی شادیاں ہوئی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے کیا۔ اسی طرح حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا نکاح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے چچازاد بھائی عون بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا اور انہی سے زینب بنت علی رضی اللہ عنہما کا نکاح بھی ہو چکا تھا(۷۵)۔ اور اس کی مثالیں صحابہ میں بہت زیادہ ہیں' بلکہ ایک اعتبار سے غور کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح بھی اپنے چچا کی پوتی سے ہوا ہے' جبکہ بنات کا لفظ بیٹیوں اور پوتیوں دونوں کو شامل ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہی ہے کہ احادیث پر اصولی اور فروعی اعتراضات یا تو نظری تعصب کا نتیجہ ہیں یا پھر مسلسل ایک مخصوص زاویے ہی سے احادیث کو دیکھنے کا اثر ہے۔ اور کوئی بھی اصولی یا فرعی اعتراض ایسا نہیں ہے کہ جس کا منقول و معقول جواب موجود نہ ہو۔ ہمیں احساس ہے کہ بعض ایسی روایات کا ابھی ہم نے طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا ہے کہ جن پر اعتراضات کیے گیے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب مکالمہ میں انہیں موضوع بحث بنا کر ہر اعتراض کی نوعیت اور حقیقت کا نقلی و عقلی تجزیہ کیا ہے۔

حواشی

(٤٠) ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کا تو انکارِ حدیث سے رجوع صریح ہے لیکن علامہ تمنا عمادی کے بارے میں بھی بعض محققین کا کہنا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے انکارِ حدیث کے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی' کیا علامہ تمنا عمادی منکر حدیث تھے؟' مجلّہ الواقعہ' کراچی' شمارہ ۱' اپریل ۲۰۱۲ء

(٤١) محمد زبیر' حافظ' فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ' مکتبہ رحمۃ للعالمین' لاہور' ۲۰۱۲ء' ص ۸۸۔۹۵

(٤٢) ابن حجر العسقلانی' أبوالفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد (المتوفی٨٥٢هـ) تهذيب التهذيب' دائرة المعارف النظامية' الهند' الطبعة الأولى' ١٣٢٦هـ' ٩٤/١

(٤٣) الذهبی' شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز (المتوفی٧٤٨هـ)' ميزان الاعتدال فی نقد الرجال' دار المعرفة للطباعة والنشر' بيروت' الطبعة الأولى' ١٣٨٢هـ/ ١٩٦٣م' ٦/١

(٤٤) البقرة ٢: ١٤٣' الحج ٢٢: ٧٨

(٤٥) الخطيب البغدادی'أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی (المتوفی٤٦٣هـ)' تاريخ بغداد' دار الغرب الإسلامی' بيروت' الطبعة الأولى' ١٤٢٢هـ/ ٢٠٠٢م' ٣٢٢/٢

(٤٦) سحر السيد عبد العزيز سالم' أضواء على مصحف عثمان بن عفان رضی الله عنه ورحلته شرقا وغربا' مؤسسة شباب الجامعة' الإسكندرية' ١٩٩١م' ص ٢٢

(٤٧) محمد بن عبد الكريم بن عبيد' روايات ونسخ الجامع الصحيح للإمام أبی عبد الله محمد بن إسماعيل البخاری دراسة وتحليل' دار إمام الدعوة' الرياض' ١٤٢٦هـ' ص ١٩'٢١۔٢٢

(٤٨) ایضاً :ص ٢٠۔٢١

(٤٩) الباجی' أبوالوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب الأندلسی (المتوفی٤٧٤هـ)' التعديل والتجريح لمن خرج له البخاری فی الجامع الصحيح' دار اللواء للنشر والتوزيع' الرياض' الطبعة الأولى' ١٤٠٦/١٩٨٦' ص ٣١١۔٣١٠

(٥٠) ایضاً :ص ٣١١

(٥١) (أمالی) محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميری الهندی ثم الديوبندی (المتوفی١٣٥٣هـ)' فيض الباری علی صحيح البخاری' دار الكتب العلمية' بيروت' الطبعة الأولى' ١٤٢٦هـ/ ٢٠٠٥م' ص ٣٣

(52) Hadith wa Sunnat, Dar ul Ifta Dar ul Uloom Deoband, India, QA No. 11124, Retrieved 01 November 2016 from http://www.darulifta-deoband.com /home/ur/Hadith--Sunnah/11124

(٥٣) عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ' قَالَ :رَأَيْتُ فِی الجَاهِلِيَّةِ قِرْدَةً اجْتَمَعَ عَلَيْهَا قِرَدَةٌ' قَدْ زَنَتْ' فَرَجَمُوهَا' فَرَجَمْتُهَا مَعَهُمْ (صحيح البخاری٥/٤٤)

(٥٤) محمد زبیر' حافظ' کیا صحیحین کی صحت پر اجماع ہے؟ ماہنامہ محدث' مارچ ۲۰۰۸ء' مجلس تحقیق اسلامی' لاہور' ۳/۴۰

(٥٥) صحيح البخاری' ٥٥/٥

(٥٦) سلیمان ندوی' سید' سیرت عائشہ' دارالابلاغ' لاہور' ۲۰۱۰ء' ص ۳۱۶

(۵۷) ایضاً: ص۳۱۷۔۳۱۸

(۵۸) ایضاً: ص۳۴۱

(۵۹) ایضاً: ۳۳۹

(۶۰) محمد زبیر، حافظ، فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ، مکتبہ رحمۃ للعالمین، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۲۱۔۷۱

(61) Unknown, Minimum age of sexual consent, Retrieved 31 October, 2016, from http://www.unicef.org/lac/2._20160308_UNICEF_LACRO_min_age_of_sexual_consent.pdf

(٦٢) الطلاق ٦٥: ٤۔

(٦٣) ابن ماجه، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (المتوفى٢٧٣هـ)، سنن ابن ماجه، دار الرسالة العالمية، الطبعة الأولى، ١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م، ص١٢٥

(٦٤) ایضاً۔

(٦٥) البقرة:٢:١٠٦

(٦٦) ابن عبد البر، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد النمرى (المتوفى٤٦٣هـ)، الاستذكار، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٢١/٢٠٠٠م/٦/ ٢٥٥

(٦٧) ابن قيم الجوزية، محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى ٧٥١هـ)، زاد المعاد فى هدى خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة السابعة والعشرون، ١٤١٥هـ/١٩٩٤م، ٥/٥٢٧

(٦٨) مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحى المدنى (المتوفى١٧٩هـ)،موطأ الإمام مالك، مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان،أبو ظبى، الطبعة الأولى، ١٤٢٥هـ / ٢٠٠٤م،كِتَابُ الرَّضَاعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِى الرَّضَاعَةِ بَعْدَ الْكِبَرِ، ٤/٨٧٣

(٦٩) صحيح مسلم ٣/١٤١٧۔

(٧٠) عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميرى، جمال الدين (المتوفى٢١٣هـ)، السيرة النبوية لابن هشام، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبى وأولاده بمصر، الطبعة الثانية، ١٣٧٥هـ/ ١٩٥٥م، ٢/٨٠۔

(٧١) الدارمى، أبومحمد عبد الله بن عبد الرحمٰن (المتوفى٢٥٥هـ)، سنن الدارمى، دار المغنى للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، ١٤١٢ هـ /٢٠٠٠ م، ١/٢٠٣۔

(٧٢) ابن عساكر، أبو القاسم على بن الحسن بن هبة الله (المتوفى ٥٧١هـ)، تاريخ دمشق، دارالفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، ١٤١٥هـ/١٩٩٥م، ١٨/٧٦

(٧٣) البيهقى، أحمد بن الحسين بن على، أبو بكر (المتوفى٤٥٨هـ)، دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٠٥هـ،١/ ٣٠٣

(٧٤) الأحزاب ٣٣:٥٠

(٧٥) محمد بن سعد بن منيع البصرى، أبو عبد الله (المتوفى ٢٣٠هـ)، الطبقات الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤١٠هـ/١٩٩٠م، ٨/٣٣٨۔

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : مکاتیب امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

مؤلف : صاحبزادہ محمد مسعود الرحمٰن

ضخامت: ۳۱۲ صفحات قیمت: ۶۰۰ روپے

بااہتمام: چوہدری رفاقت علی ملنے کا پتہ: مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار لاہور

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل کی وسیع سلطنت کے حکمران تھے۔ اُونٹ چرانے والا یہ شخص انتظامی امور میں بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کے صوبوں میں انہوں نے قابل' دیانت دار اور باکمال لوگوں کو گورنر مقرر کیا۔ وہ خود ملک کے تمام حکام سے باخبر رہتے۔ دور دراز کے علاقوں کے گورنروں پر بھی کڑی نظر رکھتے۔ اُن کا بے لاگ احتساب کرتے۔

اس کتاب میں مصنف نے امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مکتوبات جو انہوں نے صوبوں کے انتظامی سربراہوں کو لکھے' وہ جمع کر دیے ہیں اور ساتھ اُن کا اردو ترجمہ بھی لکھ دیا ہے۔

پیش لفظ صاحبزادہ انوار احمد بگوی صاحب نے لکھا ہے۔ مؤلف کا تعارف ماہرِ تعلیم چوہدری رفاقت علی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ پھر تقدیم مصنف نے لکھی ہے۔ آغاز میں امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالاتِ زندگی لکھے گئے ہیں۔ پھر مختلف صوبوں کے سربراہوں اور بیت المال کے منتظمین کے نام لکھے گئے مکتوبات کے متن معہ ترجمہ دیے گئے ہیں۔ مکتوبات کی تعداد ۲۵۰ سے زیادہ ہے۔ عموماً نامے مختصر ہیں' چند ایک طویل بھی ہیں۔ کچھ مکتوب علیہان کے نام یہ ہیں: حضرات ابوعبیدہ بن الجراح' عمرو بن العاص' سعد بن ابی وقاص' ابوموسیٰ اشعری' مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم۔ اس کے علاوہ ہرقل اور قیصرِ روم کے نام لکھے جانے والے مکتوب بھی درج ہیں۔ حضرت امیر المومنین نے جو وثیقہ دریائے نیل کے نام لکھا تھا اور وہ معاہدہ جو فتح بیت المقدس کے وقت لکھا گیا تھا' بھی اس کتاب میں درج ہیں۔ کتاب معلومات افزا اور ایک تحقیقی کاوش ہے۔ (تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

بقیہ: حرفِ اول

حکمتِ قرآن کے گزشتہ شمارے (بابت اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء) کے حرفِ اوّل ''پاکستان کی قدر کیجیے'' کو عزیزم حافظ عاطف وحید نے تحریر کیا تھا۔ اس پر چند احباب نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ کچھ نے زبانی اور ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب نے ہماری درخواست پر اپنے ملاحظات تحریراً بھیجے۔ ہم ان کے مشکور ہیں کہ انہوں نے پوری دردمندی اور 'الدین النصیحۃ' کی سپرٹ میں اپنا نقد و نظر لکھا۔ حافظ عاطف وحید نے اس کا جواب علمی اور تحلیلی و تجزیاتی انداز میں دیا ہے۔ یہ دونوں تحریریں اس شمارے میں شاملِ اشاعت ہیں جو ایک طرح سے باہمی افہام و تفہیم کی اچھی مثال ہے۔ راقم عزیزم پروفیسر محمد رشید ارشد سے بھی توقع کرتا ہے کہ وہ جلد ہی مدثر رشید صاحب کے گزشتہ مضامین کا علمی تجزیہ تحریراً پیش کریں گے۔ اس طرح کا مثبت مکالمہ ''حکمت قرآن'' کی علمی وقعت و شوکت میں اضافے کا باعث بنے گا۔ اللّٰھم ارنا حقیقۃ الاشیاء کما ھی۔ اللّٰھم ارنا الحق حقّا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ آمین یا ربّ العَالَمین! ❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

(Recap of verses 01 - 05 of Surah Al-Ma'idah and fresh exposition of verses 06 – 19 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 01 – 05 of Surah 5, Al-Ma'idah

The reader would recall that we had concluded our exposition of verses 01 – 05 of Surah Al-Ma'idah in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the exposition follows:

The first five verses of surah Al-Ma'idah make the first half of the section in which the Believers have been ordained to fulfil scrupulously all of their obligations and follow the regulations prescribed by the Divine Law about food, sex, *Salat*, justice, etcetera. The other half of the same theme is found in verses 06 – 10 of the same Surah.

1- The opening statement of the Surah enjoins that people ought to abide by the limitations and prohibitions laid down in this Surah and elsewhere in the law of Allah *(SWT)*. In this particular verse, the focus is on the halal (allowed) and haram (prohibited) viz., the livestock and the cattle – in other words 'animals as food' as enjoined by Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)*.

The verse also clarifies the allowances and the prohibitions when one is in the state of *Ihram* – the name of the simple apparel worn at the time of Pilgrimage. A detailed enunciation regarding both themes is provided in the verse.

2- The second verse uses the expression '*sha'a'ir Allah*', which refers to all those rites which, in opposition to polytheism and outright disbelief and atheism, are the characteristic symbols of an exclusive devotion to Allah *(SWT)*. Muslims are required to respect these symbols, regardless of the people among whom they are found, provided their underlying spirit is one of Allah's *(SWT) Tauhid* and that they have not been tainted by either polytheistic or pagan associations. Hence, whenever a Muslim encounters something in either the creed or practice of a non-Muslim, which embodies any element of devotion and service to the One True Allah *(SWT)*, he will identify himself with it and show respect to the symbols which represent it. For this true element in their religious life constitutes the point of agreement between them and the Muslims. The point of dispute and departure is not that they serve Allah *(SWT)*, but that they associate others in that service.

3- Verse begins by stating certain things that are forbidden to be used as food. The term 'Carrion' signifies the animal which has died a natural death. Blood and swine have also been prohibited as food. The verse also refers as *haram* to the practice of pronouncing the name of anyone or anything other than Allah *(SWT)* and dedicating the animal, as an offering, to either a holy personage, false god or goddess before slaughtering.

The 'perfection of religion' mentioned in this verse refers to making it a self-sufficient system of belief and conduct, and an order of social life providing its own answers to the questions with which man is confronted. This system contains all necessary guidance for man, either by expounding fundamental principles from which detailed directives can be deduced or by spelling out such directives explicitly so that in no circumstances would one need to look for guidance to any extraneous source.

4- Verse 4 ties the lawfulness of things to the stipulation of their being clean so that no one can argue for the lawfulness of things which are unclean. The question which arises at this point is: How are we to determine which things are clean? The answer is that everything is clean apart from those things which can be reckoned unclean either according to any of the principles embodied in the Law *(Shari'ah)* or which are repellent to man's innate sense of good taste or which civilized human beings have generally found offensive to their natural feelings of cleanliness and decency.

5- The food of the People of the Book mentioned in verse 5 includes the animals slaughtered by them. The rule that 'our food is lawful to them and theirs lawful to us' signifies that there need be no barriers between us and the People of the Book regarding food. We may eat with them and they with us. But this general proclamation of permission is preceded by a reiteration of the statement: 'All good things have been made lawful to you.'

The verse also details that Muslim men are allowed to marry those Jewish and Christian women who have been characterized as *muhsanat* (i.e. 'well-protected women'). There are, however, differences among jurists as to the detailed application of this rule

and regarding the definition of *'muhsanat'*.

In any case, all jurists agree that Muslim women are not permitted to marry the menfolk from the 'people of the Book'.

==========

Exposition of verses 06 to 19 of Surah Al-Ma'idah

Verse 06

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦

"Believers! When you stand up for Prayer wash your faces and your hands up to the elbows, and wipe your heads, and wash your feet up to the ankles. And if you are in the state of ritual impurity, purify yourselves (by taking a bath). But if you are either ill, travelling, have satisfied a want of nature or have had contact with women and find no water then have recourse to clean earth and wipe your faces and your hands therewith. Allah does not want to lay any hardship upon you; rather He wants to purify you and complete His favours upon you so that you may give thanks."

In this verse Allah *(SWT)* commands the believers to perform ablution before they pray. Before the start of ablution, it is prescribed to make an intention and say *Bismillah* [In the name of Allah *(SWT)]*. Then one should start his ablution by washing his hands and his face. Then he should wash his forearms up to his elbows. Then he should take some water in his palm and rub his head. In the end he should wash his feet up to his ankles. Moreover, the Holy Prophet *(SAAW)* has also directed that ablution is not sanctified (there is 'no' ablution) without reciting *'Bismillah'* at the beginning or it's rectification as soon as remembered.

The explanation of this injunction given by the Prophet *(SAAW)* indicates that washing of the face includes rinsing one's mouth and inhaling water into the nostrils. Unless this is done the washing of the

face is not considered complete. Likewise, since the ears are part of the head, 'wiping the head' includes wiping one's hands over the external and internal parts of the ears as well. Moreover, before starting to wash the other parts one should first wash one's hands so that the instruments of washing are themselves clean.

The verse also commands the Muslims to take a bath and cleanse themselves when in a state of conjugal impurity. *Janabah* (the state of major ritual impurity) - whether caused by the sexual act or merely by seminal discharge - renders it unlawful to perform the ritual Prayer and to touch the Qur'an.

Just as purity of the soul is a blessing, so is cleanliness of the body. Allah's *(SWT)* favour to man can be completed only when he has received comprehensive direction in respect of both spiritual purity and physical cleanliness. Moreover, Allah *(SWT)* does not burden any human being with more than he can bear. Thus He makes things easier for His servants, purifies them and bestows His blessings on them, so that they may show gratefulness.

Verse 07

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"Remember Allah's favour upon you and His covenant which He made with you when you said: 'We have heard and we obey.' So do fear Allah. Allah has full knowledge even of that which is hidden in the breasts of people."

The 'favour' mentioned here denotes illuminating the Straight Way, and entrusting to the believers the task of guidance and leadership of the whole world.

This verse reminds the Muslims of the blessings of Allah *(SWT)* and the covenant which He took from them to obey His *(SWT)* commandments and follow His Messenger *(SAAW)*, when they said "we hear and we obey." It also cautions Muslims to be mindful of the fact that Allah *(SWT)* knows those who fulfil their covenants and those who turn away. Therefore, it has been prescribed as an absolute essential to have the fear of Allah's *(SWT)* Knowledge of all things,

visible and concealed, at all times, as He *(SWT)* knows of those (thoughts) in the hearts of all creation and beyond.

Verse 08

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

"Believers! Be upright bearers of witness for Allah, and do not let the enmity of any people move you to deviate from justice. Act justly, that is nearer to God-fearing. And fear Allah. Surely Allah is well aware of what you do."

Allah *(SWT)* commands the Muslims to maintain justice and forbids them not to let enmity and hatred of others incite them to do injustice. Rather they are commanded to fight against injustice and tyranny and bear witness for Allah *(SWT)* i.e. tell the truth whenever a testimony is needed.

Again Allah *(SWT)* states that piety and righteousness is much better than abandoning justice. And fear Him alone, as He *(SWT)* is well aware of all your actions.

Similarly, the same theme appears a slightly varied context in verse 136 as well as in verses 164 through 168 of the fourth Surah of the Qur'an, An-Nisa.

Verse 09

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

"Allah has promised those who believe and do righteous deeds forgiveness from sins and a great reward."

Those who believed in Allah *(SWT)* and His Messengers *(AS)* and did righteous deeds, will have their sins forgiven and will be admitted into Paradise.

Verse 10

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

"As for those who disbelieve and deny Our signs, they are destined for the Blazing Flame."

On the other hand, those who disbelieved in Allah *(SWT)* and His revelations (signs) will be thrown into the Hellfire.

Verse 11

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"Believers! Remember Allah's favour upon you. When a certain people decided to stretch their hands against you, He restrained their hands from you. Do fear Allah. Men of faith should put their trust in Allah alone."

After the battle of the trench the enemies of Islam stretched their hands again and again against Prophet Muhammad *(SAAW)* and his followers, especially at the time of treaty of *Hudaybiyah*. But Allah *(SWT)* bestowed His favour upon the Muslims and His Messenger *(SAW)* and restrained their hands from them and made the disbelievers powerless.

This verse may also allude to the incident reported by Ibn 'Abbas *(RA)* when a group of Jews invited the Prophet *(SAAW)* and a number of his close Companions *(RA)* to dinner. They had in fact hatched a plot to pounce upon the guests and thus undermine the very foundation of Islam. But by the grace of Allah *(SWT)*, the Prophet *(SAAW)* came to know of the plot at the eleventh hour and did not go. Since the following section is addressed to the Children of Israel, this incident is alluded to here in order to mark the transition to a new subject.

The discourse which begins here has two purposes. The first is to warn the Muslims against following the ways of their predecessors, the People of the Book. The Muslims are told, therefore, that the Israelites and the followers of Jesus had made a covenant with Allah *(SWT)* in the past, in the manner that the Muslims had recently done so. The Muslims should, therefore, take heed lest they also break their covenant and fall a prey to error and misguidance as their predecessors had done.

The second is to sensitize the Jews and Christians to the errors they have committed and invite them to the true religion.

Verse 12

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

"Surely Allah took a covenant with the Children of Israel, and We raised up from them twelve of their leaders, and Allah said: 'Behold, I am with you; if you establish Prayer and pay Zakah and believe in My Prophets and help them, and lend Allah a good loan, I will certainly efface from you your evil deeds, and will surely cause you to enter the Gardens beneath which rivers flow. Whosoever of you disbelieves thereafter has indeed gone astray from the right way."

The word *naqib* in Arabic denotes supervisor and censor. There were twelve tribes among the Israelites and each tribe was required to appoint one of its members as a *naqib*, to look after their affairs and try to prevent them from becoming victims of irreligiousness and moral corruption. Although the Book of Numbers in the Bible does mention these twelve men, it does not seem to convey the sense of their being religious and moral mentors, as the term *naqib* employed by the Qur'an does. The Bible simply mentions them as the chiefs and dignitaries of their tribes.

The verse also explains that any assurance of Allah's *(SWT)* support was made conditional upon their continuous response to the call of Allah *(SWT)* and for support of His Prophets *(AS)*.

The expression 'giving' loan to Allah *(SWT)* is highly symbolic and signifies spending one's wealth for the sake of Allah *(SWT)*. Since Allah *(SWT)* has promised to return to man every penny that he spends in His way along with His reward, which will be several-fold, the Qur'an characterizes this spending as a 'loan' to Allah *(SWT)*. This spending is considered a loan provided it is a 'good loan', that is, provided the money spent in the cause of Allah *(SWT)* has been acquired by legitimate means and has been spent in accordance with the laws of Allah *(SWT)* and with sincerity and earnestness.

To efface someone's evil deeds signifies two things. First, that if a man decides to follow the Straight Path and strives to follow Allah's *(SWT)* directives in both thought and action, his soul will be purged of many evils and his way of life will gradually become free of corruption. Second, if, in spite of this reform, weaknesses still persist in a man's life he is assured that Allah *(SWT)* will not punish him and will have his failing erased from his record. For Allah *(SWT)* is not too exacting over trivial errors, providing a man has sincerely accepted the basic guidance and reformed his character.

That is, they once found the 'right way' and then allowed it to be lost and thus put themselves on the road to perdition. We have translated the Qur'anic expression '*sawa as-sabil*' as the 'right way' for the sake of brevity. A better rendering could be, 'the highroad of balance and moderation', but even this would fail to bring out the meaning fully.

In order to grasp the full significance of what is being said here one should bear in mind that in himself man constitutes a microcosm of society. He has innumerable powers and potentialities, myriad desires, feelings and inclinations, and a host of divergent urges. Social life consists of a huge network of complex relationships, and with the growth of civilization and culture the complexity of these relationships increases. There is also a rich fund of resources in the world and there are countless possibilities for their utilization; as a result, man is confronted with a plethora of choices and problems.

The fact that man has inherent limitations means that he is incapable of viewing in one sweep and in a balanced way the entire span of existence. Hence, man is in no position to prescribe for his kind a judicious way of life - a way of life wherein justice is done to all his powers and capacities; in which a wholesome balance is maintained between all his inherent potentialities; in which all his urges are given their due; in which his two-fold need for inner satisfaction and external self-realization is fully met; in which various aspects of human life are taken into proper consideration, giving birth to an integrated scheme with a built-in capacity to harmonize the multifarious strains and stresses of social life; in which material resources are fully exploited in the best interests of both the individual and society and within the

framework of equity, justice and righteousness. When man takes upon himself the task of prescribing the guidelines for his life and becomes his own law-maker, his mind tends to become preoccupied with one specific aspect of human life, with one of the numerous demands of his nature, with one of the myriad problems calling for solution. His mental involvement is liable to be so intense that he adopts - consciously or otherwise - an unjust attitude towards all the other aspects, requirements and problems of human life. Consequently, when such opinions are imposed, the balance which ought to prevail in man's life is disrupted and he begins to swing either towards one extreme or the other. Gradually, this deviation assumes intolerable proportions. A reaction sets in, and justice is demanded for the neglected aspects of human life. Still, human life remains deprived of justice. The reason for this failure is that man's reaction to imbalance is itself devoid of balance. The new dispensation in turn persists in excessive preoccupation with either one specific aspect, problem or requirement of human life at the expense of all the others. Thus human life is denied judicious and balanced progress. Man continues to stumble hither and thither; from one form of self-destruction to another. All courses of life charted by man himself are winding and crooked. They move in the wrong direction, reach the wrong end and then turn back in another wrong direction.

Among these numerous ways - all false - there is just one way that lies exactly in the 'middle'. This way alone does full justice to all of man's various potentialities and urges, to all his instincts and predispositions, to all the multifarious claims of both the body and the spirit; in short, to all aspects of his life. In this way there is no crookedness; it is the one course of life in which nothing is given either too much consideration or too little, and nothing suffers inequity and injustice. Man's very nature thirsts for such a way, and the succession of revolts against false ways of life is merely a manifestation of his constant quest for this right and straight way. Left to himself, man is incapable of charting this way. It is Allah *(SWT)* alone Who can direct him to it; and indeed the Prophets *(AS)* were sent for this very purpose.

The Qur'an designates this way as *sawa as-sabil* ('the right way') in the present verse and elsewhere as *al-sirat al-mustaqim*. (see Surah 1, Al-

Fatiha, verse 5 for an example) This is the road which goes amidst the countless winding and crooked paths of life; the road which leads man, disregarding all the curved and crooked paths, straight on to his success, right from this world to the Hereafter. Whoever goes along it enjoys rectitude in this world and success and felicity in the Next, but whoever loses this road is bound to become a victim of false beliefs and false ways of conduct and thus comes to have a wrong orientation in life. This will lead him to Hell, where all bent and crooked paths end. The following illustrates man's dilemma.

In modern times some philosophers have been so impressed by this constant swinging in human life, from one extreme to another, as to have mistakenly argued that the dialectical process is the natural course of human life. They conclude, therefore, that the only way for human life to progress is that a thesis should first swing it in one direction, and then an antithesis swings it in the opposite direction, after which there will emerge a synthesis which constitutes the course of human progress. These curved lines from one extreme to the other do not indicate the correct course of human progress. Rather they represent the tragic stumbling, which obstructs the true progress of human life time and again. Every extreme thesis sets life on a certain course and continues to pull it in that direction for some time. When human life is thus thrown off its 'right course' the result is that certain realities of life - which had not received their due - rise up in revolt, and this revolt often assumes the form of an antithesis. This revolt begins to pull life in the opposite direction. As the 'right way' is approached the conflicting ideas - the thesis and antithesis - begin to effect some kind of mutual compromise, leading to the emergence of a synthesis. This synthesis comprises many elements conducive to the good of mankind. But since societies which do not submit to the guidance of the Prophets *(AS)* are deprived both of the signposts that might indicate the 'right way' and of faith to help steady man's feet thereon this synthesis does not permit human life to maintain the golden mean. Its momentum is so powerful that it once more pushes life to the opposite extreme. At this point, certain realities are once again denied their due, with the result that another antithesis emerges in reaction to the iniquities of the earlier ideology. Had the light of the Qur'an been available to these short-

sighted philosophers, and had they been able to perceive the 'right way' envisaged by the Qur'an, they would have realized that this was the true course of human progress.

Verse 13

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"Then, for their breach of the covenant We cast them away from Our mercy and caused their hearts to harden. (And now they are in such a state that) they pervert the words from their context and thus distort their meaning, and have forgotten a good portion of the teaching they were imparted, and regarding all except a few of them you continue to learn that they committed acts of treachery. Pardon them, then, and overlook their deeds. Surely Allah loves those who do good deeds."

Allah *(SWT)* says that He cursed the Children of Israel and made their hearts so that they do not heed any advice. This was a punishment because they distorted His revelations and neglected much of what they were enjoined.

Moreover, they always try to deceive the Muslims and make plots against them, but Allah *(SWT)* encourages His believers to forgive them and overlook their misdeeds.

In essence, Allah *(SWT)* loves those who do 'good'.

Verse 14

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

"We also took a covenant from those who said: 'We are Christians'; but they forgot a good portion of the teaching they had been imparted with. Wherefore We aroused enmity and spite between them till the Day of Resurrection, and ultimately Allah will tell them what they had contrived."

Some are of the opinion that the word *Nasara* (meaning Christians) is derived from *Nasirah* (Nazareth), the birth-place of the Messiah. In fact,

this word is not derived from *Nasirah* (Nazareth) but from the word *nusrah,* and the basis of this derivation is the question posed by the Messiah to his disciples: 'Who are my supporters (*ansari*) in the way of Allah?' In response to this they had said: 'We are the supporters (*ansar*) (in the way) of Allah.' Christian authors have been misled by the resemblance between the words *Nasirah* and *Nasara* into believing that the name of the sect founded in the early history of Christianity, and contemptuously characterized as either Nazarenes or Ebonites served as the basis of the Qur'anic designation of the Christians. But here the Qur'an categorically states that they had declared that they were '*Nasara*' and it is obvious that the Christians never called themselves 'Nazarenes'.

In this connection it should be recalled that Jesus *(AS)* never called his followers 'Christians' for he had not come to found a new religion named after him. His mission was to revive the religion of Moses *(AS)* and of all the Prophets *(AS)* who preceded him as well as of the one who was to appear after him. Hence, he neither formed any cult divorced from the Israelites and the followers of the Mosaic Law nor designated his followers by any distinctive name. Likewise, his early followers neither considered themselves to be separate from the Israelite community nor developed into an independent group nor adopted any distinctive symbol and name. They worshipped in the temple of Jerusalem along with other Jews and considered themselves to be followers of the Mosaic Law. (see Acts 3:1-10; 21: 14-15,21)

The Qur'an, therefore, does not refer to the followers of Christ as Christians. It reminds them rather that they belong to those who responded to the query of Jesus: 'Who are my supporters (*ansari*) in the way of Allah?' by saying that they were his *ansar* (supporters) in Allah's *(SWT)* cause. (See Surah 61, Al-Saff: verse 14). It is an irony of fate that far from feeling grateful at being referred to by a dignified appellation Christian missionaries take offence at the fact that the Qur'an designates them as *Nasara* rather than as 'Christians'. However, it has to be mentioned here that Christians claim (falsely) that the persons 'Virgin Mariyam *(AS)*' and 'Prophet Eisa ibn Mariyam *(AS)*' referred to in the Qur'an are <u>not</u> the same persons whom they (the Christians) "worship" as part of their erroneous doctrine of 'Trinity'.

The verse refers to the covenant that Allah *(SWT)* made with the disciples of Jesus *(AS)* that whenever He sends His Last Prophet, Muhammad *(SAAW)*, they would follow him and support him. But they also broke the covenant and neglected much of what they were enjoined, discarding Allah's Book and disobeying His Prophet *(SAAW)*. This is why as a punishment Allah *(SWT)* stirred among them enmity and hatred for each other, which will last till the Day of Judgment when Allah *(SWT)* will declare to them all that they have done.

Verse 15

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيرٗا مِّمَّا كُنتُمۡ تُخۡفُونَ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٖۚ قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٞ وَكِتَٰبٞ مُّبِينٞ ١٥

"People of the Book! Now Our Messenger has come to you: he makes clear to you a good many things of the Book which you were wont to conceal, and also passes over many things. There has now come to you a light from Allah, and a clear Book."

Allah *(SWT)* discloses some of the dishonest and treacherous dealings of the people of the Book where He deems it necessary in order to strengthen the cause of the true religion, and ignores the disclosure of those which are not truly indispensable.

The Jews and the Christians used to conceal and distort the true teachings of the Books given to their Prophets (AS), particularly the contexts and contents which mentioned the final Messenger, Prophet Muhammad *(SAAW)*. Then Allah *(SWT)* sent His Last Messenger *(SAAW)* in physical form, explaining to them the true teachings that they used to hide and guiding them towards the truth, with the light of revelation bestowed upon him *(SAAW)* and with the Qur'an.

Verse 16

يَهۡدِي بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضۡوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخۡرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذۡنِهِۦ وَيَهۡدِيهِمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ١٦

"through which Allah shows to all who seek to please Him the paths leading to safety. He brings them out, by His leave, from darkness to light and directs them on to the straight way."

This verse picks up the theme from where it was left in the previous one.

The word 'safety' here denotes safety from false perception and outlook, safety from misdeeds and their consequences. Whoever seeks guidance from the Book of Allah *(SWT)* and from the example of the Messenger *(SAAW)* can find out how to keep himself safe from errors at each of life's crossroads.

In a nutshell, with this light of revelation bestowed upon the Prophet *(SWT)* and the Book, Allah *(SWT)* guides those who seek His pleasure to the ways of peace. And He brings them out of the darkness of disbelief and evil into the light of truth. As mentioned in verse 257 of Surah Al-Baqarah (2: 257), the light is always mentioned in a singular form while the darkness in the plural, because disbelief comes in different shades of evil and sin while there is only one truth.

Verse 17

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"Indeed those who said: 'Christ, the son of Mary, he is indeed God', disbelieved. Say (O Muhammad!): 'Who could have overruled Allah had He so willed to destroy Christ, the son of Mary, and his mother, and all those who are on earth?' For to Allah belongs the dominion of the heavens and the earth and all that is between them; He creates what He wills. Allah is All-Powerful."

The original mistake committed by the Christians in declaring Jesus *(AS)* to be a combination of human and divine essences turned Jesus *(AS)* into a mystery for them, and the more the Christian scholars tried to solve this mystery by resorting to conjecture and rhetorical extravagance the more involved the whole matter became. Those who were more impressed by the humanity of Jesus *(AS)* stressed his being the son of God and considered him to be one of the three gods. Those who were more impressed by the divinity of Jesus *(AS)* considered him to be none other than God, stressing that he was the human incarnation of God, and worshipped him as God. Those who tried to strike a middle path spent all their efforts hammering out subtle verbal formulations of the Trinity that would allow people to consider the Messiah *(AS)* to be God and man at one and the same time, to affirm

that God and the Messiah *(AS)* are independent and simultaneously constitute an inseparable whole (see Surah 4, An-Nisa verses 212, 213 & 215 for more details on the topic).

This statement hints at the childishness of those who have been misled into believing that the Messiah *(AS)* himself is God either because of his miraculous birth or because of his flawless moral character or because of the miracles which he performed. The Messiah *(AS)* is merely a sign of the innumerable wonders of Allah's *(SWT)* creation; a sign which somehow dazzled the eyes of those superficial people. Had their perception been wider they would have been able to see that there are even more inspiring examples of His creation and infinite power. If anything their attitude was indicative of the intellectual puerility of those who were so overawed by the excellence of a creature as to mistake him for the Creator *(SWT)*. Those whose intelligence penetrates through the excellence of creatures, who look upon them merely as signs of the magnificent power of Allah *(SWT)*, and who are led by such observations to a reinforcement of faith in the Creator *(SWT)* are truly wise.

Verse 18

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

"The Jews and the Christians say: 'We are Allah's children and His beloved ones.' Ask them: 'Why, then, does He chastise you for your sins?' You are the same as other men He has created. He forgives whom He wills and chastises whom He wills. And to Allah belongs the dominion of the heavens and the earth, and all that is between them. To Him is the eventual return."

The Jews and the Christians thought (and still think) of themselves as the chosen ones and they say that they are the 'children' of Allah *(SWT)*. But Allah *(SWT)* commands His Prophet *(SAW)* to ask them that if you really are true in your claims that you are His loved ones then why does He *(SWT)* punish you and make you suffer for your crimes?

The fact is that they are no different than the rest of His *(SWT)* creations, thus their being Jews or Christians does not make them special or immune from His *(SWT)* punishment; rather He punishes whom He Wills and He forgives whom He wills.

Finally, everything is under Allah's *(SWT)* Supreme control and power and everything is eventually going to return to Him. He has control over the heavens and the earth and all that lies between them. And all shall return to Him *(SWT)*.

Verse 19

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝

"People of the Book! After a long interlude during which no Messengers have appeared there has come to you Our Messenger to elucidate the teaching of the true faith lest you say: 'No bearer of glad tidings and no warner has come to us.' For now, there indeed has come to you a bearer of glad tidings and a warner, Allah is All-Powerful."

In the present context of this verse, this sentence is extremely eloquent and subtle. It signifies that the same One Allah *(SWT)* who had sent bearers of warnings *(AS)* and bearers of glad tidings *(AS)* to men in the past has now sent Muhammad *(SAAW)* with the same task. At the same time, it also means that they should not treat the message of this bearer of warnings *(SAAW)* and bearer of glad tidings *(SAAW)* lightly and nonchalantly. They should bear in mind that if they disregard the injunctions of Allah *(SWT)*, He can chastise them as He *(SWT)* wills, for He *(SWT)* is All-Powerful and All-Mighty.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی!

مدیر ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' لاہور

ایوب بیگ مرزا

کے مدبرانہ، حکیمانہ، ناصحانہ، اداریوں کا حسین مرقع

بعنوان: ''حق گوئی'' شائع ہوگیا ہے

جس کے مطالعے سے عالمی اور ملکی حالات پر بصارت ہی نہیں،
بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے —— اور
عمل کے لیے ایک جذبۂ محرکہ بھی پیدا ہوتا ہے

☆

404 صفحات ❁ عمدہ پرنٹنگ ❁ امپورٹڈ بک پیپر
❁ دیدہ زیب نفیس ٹائٹل

خود پڑھیں
دوسروں کو تحفہ
میں دیجیے!

قیمت صرف: 300 روپے

شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501
email : maktaba@tanzeem.org
website www.tanzeem.org

Quarterly
Jan.-Mar. 2017

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 36 No. 1

مرکزی **انجمن خُدّامُ القُرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حِکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ